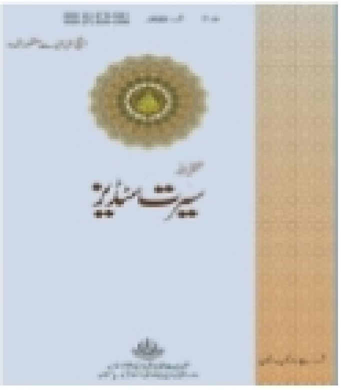

سیرت سٹڈیز Seerat Studies

E(ISSN): 2710-5261, P(ISSN): 2520-3398

Publisher: Department of Seerat Studies

Allama Iqbal Open University, Islamabad, Pakistan

Website: https://ojs.aiou.edu.pk/index.php/jss

Vol.09 Issue: 09 (January – December 2024)

Date of Publication: 25-December 2024

HEC Category (July 2024-2025): Y

https://ojs.aiou.edu.pk/index.php/jss

Article	رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں فرح وحزن کے واقعات اوران کے اثرات
Authors & Affiliations	1. ***Zainb Rehman*** *MS, Scholar, Department of Hadith & its Sciences, International Islamic University, Islamabad* zainabrehman958@gmail.com 2. ***Dr. Ali Tariq*** *Assistant Professor/Incharge Academic Affair, Department of Hadith & its Sciences, International Islamic University, Islamabad* *alitariq11@gmail.com*
Dates	***Received*** 14-04-2024 ***Accepted*** 15-07-2024 ***Published*** 12-10-2024
Citation	Zainb Rehman and Dr. Ali Tariq, 2024. رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں فرح وحزن کے واقعات اوران کے اثرات [online] IRI - Islamic Research Index - Allama Iqbal Open University, Islamabad. Available at: https://iri.aiou.edu.pk [Accessed 10 December 2023].
Copyright Information	رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں فرح وحزن کے واقعات اوران کے اثرات 2024@ by Zainb Rehman and Dr. Ali Tariq is licensed under Attribution-Share Alike 4.0 International
Publisher Information	Department of Seerat Studies, Faculty of Arabic & Islamic Studies, Allama Iqbal Open University, Islamabad, Pakistan https://www. aiou.edu.pk/

Indexing & Abstracting Agencies

IRI(AIOU)	HJRS(HEC)	Tehqiqat	Asian Indexing	Research Bib	Atla Religion Database (Atla RDB)	Scientific Indexing Services (SIS)
Islamic Research Index	HJRS HEC Journal Recognition System	تحقیقات	ASIAN Research Index	Academic Resource Index ResearchBib	ATLA Religion Database	SIS

رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں فرح وحزن کے واقعات اوران کے اثرات

Abstract

The study of Seerah has always held a distinguished place among Islamic sciences, as it is rooted in the life of the Prophet Muhammad (PBUH), which serves as a beacon house and guiding tower for all dimensions and aspects of human existence. Life, in its essence, is never free from moments of joy and sorrow, as these emotions are intrinsic to human nature. Given this reality, individuals require continuous guidance on how to navigate and express these emotions appropriately. It is only natural, then, that the life of the Mercy to the Worlds (PBUH) being the noblest example for the believers encompasses profound and practical examples of such emotional expressions.

This article presents selected incidents from the blessed life of the Prophet (PBUH), analyzing them to highlight the etiquettes of expressing joy and grief and point out the transformative effects these practices can have on individuals and society.

ملخص:

علمِ سیرت کواسلامی علوم میں امتیازی حیثیت حاصل ہے کیونکہ اس علم کی بنیاد حیاتِ نبوی ہے جو زندگی کے تمام مراحل میں ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ زندگی کا کوئی بھی مرحلہ خوشی اور غم کی کیفیت سے خالی نہیں ہوتا۔چونکہ خوشی اور غم فطری کیفیات ہیں جن سے گزرنے کے دوران انسان مسلسل رہنمائی کا محتاج ہوتا ہے اس لیے یہ ناممکن تھا کہ رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ان کیفیات کے اظہار سے خالی ہوتی۔حیاتِ طیبہ کے چند واقعات قارئین کے پیشِ خدمت کیے جاتے ہیں جن کے تجزیہ سے ان کیفیات کے اظہار کے آداب اور نتیجتاً ان کے اثرات واضح ہو جائیں گے۔

مقدمہ

حدیث کا علم اسلامی علوم میں ایک خاص مقام رکھتا ہے، کیونکہ اس میں نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے تمام پہلو محفوظ کیے گئے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی زندگی ہمارے لیے ہر معاملے میں کامل نمونہ ہے، چاہے وہ عبادات ہوں، معاملات، اخلاقیات یا انسانی جذبات کے مختلف مراحل۔ زندگی کے نشیب وفراز، خوشی اور غم، امید اور ناامیدی جیسے جذبات ہر انسان کی فطرت میں شامل ہیں، جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا :﴿وَأَنَّهُ هُوَ أَضْحَكَ وَأَبْكَىٰ﴾[1] النجم:43" اور وہی ہے جو ہنساتا ہے اور رلاتا ہے۔ "ان جذبات کا متوازن اظہار اور ان پر قابو پانے کا بہترین طریقہ ہمیں نبی کریم ﷺ کی سیرت سے حاصل ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ہمیں سکھایا کہ خوشی کے مواقع پر کس طرح اعتدال اور شکر گزاری اختیار کرنی چاہیے اور غم کے لمحات میں کس طرح صبر، حوصلہ اور اللہ تعالیٰ سے رجوع کرنا چاہیے۔ خوشی اور غم کے اظہار میں اسلامی آداب کو اپنانا، نہ صرف ایک متوازن شخصیت کی تشکیل میں مدد دیتا ہے بلکہ یہ دنیاوی اور اخروی کامیابی کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: فرح (خوشی) دل کی سب سے بڑی نعمت، لذت اور راحت ہے، اور غم و پریشانی اس کے لیے عذاب کی مانند ہے۔"

یہ موضوع آج کے دور میں بھی بے حد اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ انسان کی زندگی خوشی اور غم کے درمیان ہی گزرتی ہے۔ بعض لوگ خوشی میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں اور اسے محض دنیاوی لذتوں کا ذریعہ بنا لیتے ہیں، جبکہ بعض لوگ غم اور پریشانیوں میں ایسا گھر جاتے ہیں کہ وہ مایوسی اور ناامیدی کا شکار ہو کر اپنی زندگی تک ختم کرنے کی نوبت پر آ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا بھر میں ذہنی صحت (Mental Health) پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے، اور مختلف ممالک میں نفسیاتی مسائل، ڈپریشن اور خودکشی جیسے المیوں سے نمٹنے کے لیے ادارے قائم کیے جا رہے ہیں۔ لیکن اسلام نے صدیوں پہلے ان مسائل کا حل پیش کیا تھا، جہاں نہ صرف غم اور خوشی کی حقیقت کو تسلیم کیا گیا، بلکہ ان کے اظہار کے عملی اور متوازن اصول بھی سکھائے گئے۔

یہ مقالہ نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ میں خوشی اور غم کے واقعات اور ان کے اثرات کا جائزہ لے گا، تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ آپ ﷺ نے ان جذبات کا اظہار کس طرح کیا اور امت کے لیے کون سا طرزِ عمل اپنانا بہتر قرار دیا۔ مزید برآں، یہ بھی دیکھا جائے گا کہ اگر نبی کریم ﷺ خوشی اور غم کے اظہار میں کوئی اور طریقہ اختیار فرماتے، تو اس کے کیا اثرات مرتب ہو سکتے تھے۔ اس تحقیق کے ذریعے ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ آپ ﷺ کی زندگی ہمیں ہر حال میں جذباتی توازن، ذہنی سکون اور ایک مضبوط شخصیت کے اصول سکھاتی ہے، تاکہ ہم ایک متوازن اور خوشحال زندگی گزار سکیں۔ **حیات طیبہ سے فرح کے واقعات اور ان کے اثرات معاشرتی اثرات**

1. **اتحادِ امت:**

کسی بھی معاشرے کی بقا اور ترقی کے لیے اتحاد بنیادی عنصر ہے۔ جب افراد باہمی محبت، ہمدردی، اور مشترکہ مقاصد کی جانب گامزن ہوتے ہیں تو ایک مضبوط اور مستحکم سماج وجود میں آتا ہے۔ اسلام میں امت کے اتحاد کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، اور نبی کریم ﷺ نے اپنی زندگی میں قولاً و عملاً اس کے قیام کی بھرپور کوشش کی۔ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو ایک جسم کی مانند قرار دیا، جہاں ایک عضو کو تکلیف ہو تو پورا جسم بے چین ہو جاتا ہے۔ امت کے اتحاد کے لیے نبی کریم ﷺ کے اظہارِ مسرت کی اہمیت بھی نمایاں ہے۔ آپ ﷺ کی خوشی اور تبسم صحابہ کے دلوں میں اطمینان اور محبت پیدا کرتے، ان کے جذبات کو تقویت دیتے اور انہیں مزید نیکی پر آمادہ کرتے۔

حضرت جریر بن عبداللہ البجلی رضی اللہ عنہ کی روایت اس حقیقت کو واضح کرتی ہے۔ حضرت جریر بن عبداللہ البجلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ: "ہم دن کے ابتدائی حصہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، کچھ لوگ ننگے بدن، ننگے پیر، تلواریں لٹکائے ہوئے آئے، زیادہ تر لوگ قبیلہ مضر کے تھے، بلکہ سبھی مضر ہی کے تھے۔ **ان کی فاقہ مستی دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کا رنگ بدل گیا،** آپ اندر گئے، پھر نکلے، تو بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا، انہوں نے اذان دی، پھر اقامت کہی، آپ نے نماز پڑھائی، پھر آپ نے خطبہ دیا، تو فرمایا: ”لوگو! ڈرو، تم اپنے رب سے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا، اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا۔ اور انہیں دونوں (میاں بیوی) سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیئے۔ اور اس اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم سب ایک دوسرے سے مانگتے ہو۔ قرابت داریوں کا خیال رکھو کہ وہ ٹوٹنے نہ پائیں، بیشک اللہ تمہارا نگہبان ہے، اور اللہ سے ڈرو، اور تم میں سے ہر شخص یہ (دھیان رکھے اور) دیکھتا رہے کہ آنے والے کل کے لیے اس نے کیا آگے بھیجا ہے، آدمی کو چاہیئے کہ اپنے دینار میں سے، اپنے درہم میں سے، اپنے

کپڑے میں سے، اپنے گیہوں کے صاع میں سے، اپنے کھجور کے صاع میں سے صدقہ کرے''، یہاں تک کہ آپ نے فرمایا: ''اگرچہ کھجور کا ایک ٹکڑا ہی سہی''، چنانچہ انصار کا ایک شخص (روپیوں سے بھری) ایک تھیلی لے کر آیا جو اس کی ہتھیلی سے سنبھل نہیں رہی تھی بلکہ سنبھلی ہی نہیں۔ پھر تو لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ کھانے اور کپڑے کے دو ڈھیر اکٹھے ہو گئے۔ اور میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا **چہرہ انور کھل اٹھا ہے گویا وہ سونے کا ملمع کیا ہوا ٹکڑا ہو** (اس موقع پر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اسلام میں کوئی اچھا طریقہ جاری کرے گا، اس کے لیے دہرا اجر ہو گا: ایک اس کے جاری کرنے کا، دوسرا جو اس پر عمل کریں گے ان کا اجر، بغیر اس کے کہ ان کے اجر میں کوئی کمی کی جائے۔ اور جس نے اسلام میں کوئی برا طریقہ جاری کیا، تو اسے اس کے جاری کرنے کا گناہ ملے گا اور جو اس پر عمل کریں گے ان کا گناہ بھی بغیر اس کے کہ ان کے گناہ میں کوئی کمی کی جائے۔"[2] (مسلم)

یہاں نبی کریم ﷺ کے تاثرات کو انتہائی باریک بینی سے بیان کیا گیا ہے، جو اس واقعے کی گہرائی کو مزید نمایاں کرتا ہے۔ علماء نے اس جملے "كأنه مذهبة" (گویا وہ سونے کا **ملمع** کیا ہوا ٹکڑا ہو) کی مختلف تشریحات بیان کی ہیں۔ علامہ سندھیؒ کے مطابق، یہاں "مذهبة" سے مراد "مموه بالذهب" یعنی سونے سے **ملمع** شدہ چیز ہے، جو انتہائی درخشاں اور خوبصورت ہوتی ہے، اس تشبیہ سے نبی کریم ﷺ کے چہرے کی روشنی اور خوشی کی شدت ظاہر ہوتی ہے[3] (حاشیہ السندی علی النسائی)۔ شرح ریاض الصالحین میں بیان کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے چہرے کی روشنی دراصل اس دلی خوشی اور مسرت کی علامت تھی جو صحابہ کے ایثار اور قربانی کو دیکھ کر پیدا ہوئی[4] (دلیل الفالحین فی شرح ریاض الصالحین)۔

یہ روایت ثابت کرتی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے تاثرات بھی امت کی تربیت میں بنیادی کردار ادا کرتے تھے۔ جب آپ ﷺ غمگیں ہوتے تو صحابہ فکرمند ہو جاتے، اور جب آپ ﷺ خوشی کا اظہار فرماتے تو وہ مزید نیکی کی طرف راغب ہوتے۔ ایک عام انسانی رویہ ہے کہ اگر کسی قائد کی خوشی کسی عمل پر ظاہر ہو، تو اس کے پیروکار اس عمل کو اپنانے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ بچوں میں یہ فطری رجحان پایا جاتا ہے کہ جب ان کے والدین کسی اچھے عمل پر خوشی ظاہر کرتے ہیں، تو وہ اسے مستقل اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح، ایک ملازم اگر دیکھے کہ اس کا افسر اس کی محنت پر مسرور ہے، تو وہ مزید لگن کے ساتھ کام کرتا ہے۔

اگر نبی کریم ﷺ صرف صدقے کی ترغیب دیتے لیکن اس کے بعد اپنی خوشی کو ظاہر نہ کرتے، تو یہ جوش وقتی ہو سکتا تھا۔ لیکن جب آپ ﷺ نے اپنی مسرت کو کھل کر ظاہر کیا، تو یہ جذبہ مزید پروان چڑھا اور صدقہ و ایثار امت کے افراد کے کردار کا مستقل حصہ بن گیا۔ یہی وہ عنصر تھا جس نے صحابہ کرام کو ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا، وہ جو کبھی قبائلی دشمنیوں میں جکڑے ہوئے تھے، وہ ایک جسم اور ایک امت میں تبدیل ہو گئے۔

اگر نبی کریم ﷺ نے مسکراہٹ اور خوشی ظاہر نہ کی ہوتی؟

1. اسی لمحے صحابہ کا جوش کم ہو سکتا تھا – اگر نبی کریم ﷺ اپنی خوشی کو دبائے رکھتے اور اپنے چہرے پر مسرت ظاہر نہ کرتے، تو شاید صحابہ کو یہ اندازہ نہ ہوتا کہ یہ عمل اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو کتنا محبوب ہے۔

2. آئندہ نسلوں میں نیکی کے جذبات کی شدت کم ہو سکتی تھی — نبی کریم ﷺ نے اپنی مسرت کا کھل کر اظہار کیا، جس نے صحابہ کو نہ صرف اس لمحے بلکہ آئندہ زندگی میں بھی ایثار کی راہ اپنانے کی ترغیب دی۔ اگر آپ ﷺ نے یہ نہ کیا ہوتا، تو ممکن تھا کہ مستقبل میں امت کے اندر قربانی، اتحاد، اور فلاحی جذبے کی شدت کم ہو جاتی۔

3. ایک غیر محسوس تربیت کا موقع ضائع ہو جاتا —لوگ الفاظ سے زیادہ چہرے کے تاثرات سے سیکھتے ہیں۔ اگر نبی کریم ﷺ نے مسرت ظاہر نہ کی ہوتی، تو شاید یہ تربیت اتنی گہرائی میں نہ اترتی اور صحابہ کے اندر وہ جذبہ پروان نہ چڑھتا جو بعد میں پوری امت میں پھیل گیا۔

نبی کریم ﷺ کی خوشی اور اس کا اظہار امت کے اندر وحدت، محبت، اور خیر خواہی کے جذبات کو تقویت دینے کا ایک اہم ذریعہ تھا۔ یہ واقعہ ہمیں سکھاتا ہے کہ ایک کامیاب رہنما نہ صرف نیکی کی ترغیب دیتا ہے بلکہ جب کوئی بھلائی ہوتی دیکھتا ہے تو اپنی خوشی کا کھل کر اظہار کرتا ہے، تاکہ دوسروں کو مزید نیکی پر ابھارا جا سکے۔ نبی کریم ﷺ کی مسرت کا اثر صحابہ کی زندگیوں میں اتنا گہرا تھا کہ وہ خود دوسروں کو نیکی کی طرف راغب کرنے لگے۔ یہی طرزِ عمل آج بھی امت کے اتحاد، استحکام اور ترقی کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔

1. افراد میں امید کی کرن اجاگر کرنے کے ذریعے خوشحال معاشرے کی تشکیل

کسی بھی معاشرے کی ترقی اور خوشحالی کے لیے ضروری ہے کہ افراد میں امید اور حوصلہ برقرار رہے۔ جب لوگ مشکلات کے باعث مایوس ہو جاتے ہیں، تو ان کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے، اور وہ معاشرتی ترقی میں مؤثر کردار ادا کرنے سے قاصر ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس، جب افراد کو حوصلہ اور امید دی جاتی ہے، تو وہ مشکلات کو چیلنج کے طور پر قبول کرتے ہیں اور ایک بہتر مستقبل کے لیے محنت جاری رکھتے ہیں۔

اسلام میں امید اور مثبت طرزِ فکر کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، اور نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ میں جا بجا ایسے واقعات ملتے ہیں جہاں آپ ﷺ نے مشکل ترین حالات میں بھی افراد کو مایوسی سے نکال کر امید اور یقین کی راہ دکھائی۔ آپ ﷺ کا تبسم، شفقت بھرے الفاظ اور حوصلہ افزائی پر مبنی انداز، نہ صرف فرد کے لیے تقویت کا باعث بنتے بلکہ اجتماعی طور پر پورے معاشرے میں استحکام، اتحاد اور ترقی کے عناصر پیدا کرتے۔

غزوہ حنین کے موقع پر نبی کریم ﷺ کی خوشی اور امید افزا رویے کی ایک روشن مثال ملتی ہے۔ حضرت سہل بن حنظلیہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں": لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حنین کے دن چلے اور بہت ہی تیزی کے ساتھ چلے، یہاں تک کہ شام ہو گئی، میں نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اتنے میں ایک سوار نے آ کر کہا: اللہ کے رسول! میں آپ لوگوں کے آگے گیا، یہاں تک کہ فلاں فلاں پہاڑ پر چڑھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قبیلہ ہوازن کے لوگ سب کے سب اپنی عورتوں، چوپایوں اور بکریوں کے ساتھ بھاری تعداد میں مقام حنین میں جمع ہیں، **یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا: ”ان شاءاللہ یہ سب کل ہم مسلمانوں کا مال غنیمت ہوں گے“،** پھر فرمایا: ”رات میں ہماری پہرہ داری کون کرے گا؟“ انس بن ابومرثد غنوی رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کے رسول! میں کروں گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تو سوار ہو جاؤ“، چنانچہ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اس گھاٹی میں جاؤ یہاں تک کہ اس کی بلندی پہ پہنچ جاؤ اور ایسا نہ ہو کہ ہم

تمہاری وجہ سے آج کی رات دھوکہ کھا جائیں''، جب ہم نے صبح کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مصلے پر آئے، آپ نے دو رکعتیں پڑھیں پھر فرمایا: ''تم نے اپنے سوار کو دیکھا؟'' لوگوں نے کہا: اللہ کے رسول! ہم نے اسے نہیں دیکھا، پھر نماز کے لیے اقامت کہی گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھنے لگے لیکن دوران نماز کنکھیوں سے گھاٹی کی طرف دیکھ رہے تھے، یہاں تک کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ چکے اور سلام پھیرا تو فرمایا: ''خوش ہو جاؤ! تمہارا سوار آ گیا''، ہم درختوں کے درمیان سے گھاٹی کی طرف دیکھنے لگے، یکایک وہی سوار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور سلام کیا اور کہنے لگا: میں گھاٹی کے بالائی حصہ پہ چلا گیا تھا جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا تھا تو جب صبح کی تو میں نے دونوں گھاٹیوں پر چڑھ کر دیکھا تو کوئی بھی نہیں دکھائی پڑا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: ''کیا تم آج رات گھوڑے سے اترے تھے؟''، انہوں نے کہا: نہیں، البتہ نماز پڑھنے کے لیے یا قضائے حاجت کے لیے اترا تھا، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: ''تم نے اپنے لیے جنت کو واجب کر لیا، اب اگر اس کے بعد تم عمل نہ کرو تو تمہیں کچھ نقصان نہ ہو گا۔'[5] (ابوداؤد)

یہ واقعہ نہایت نازک موقع پر پیش آیا، جب دشمن کی فوج پوری تیاری کے ساتھ وادی حنین میں موجود تھی۔ ایسے وقت میں عموماً جنگجو ذہنی دباؤ اور خوف کا شکار ہو سکتے تھے، لیکن نبی کریم ﷺ کے چہرے پر سکون اور تبسم دیکھ کر صحابہ کے دلوں سے خوف جاتا رہا۔ یہ تبسم محض ایک رسمی مسکراہٹ نہ تھی، بلکہ اس میں پورے لشکر کے لیے ایک واضح پیغام تھا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ہمارے ساتھ ہے اور ہمیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ علماء نے نبی کریم ﷺ کے تبسم کو قیادت کی بہترین مثال قرار دیا ہے، کیونکہ ایک رہنما جب خود پر اعتماد اور مطمئن ہوتا ہے، تو اس کا اثر پوری جماعت پر پڑتا ہے۔ اگر نبی کریم ﷺ اپنے چہرے پر پریشانی یا خوف کے آثار ظاہر کرتے، تو یہ پوری فوج پر منفی اثر ڈالتا، لیکن آپ ﷺ کے تبسم نے ایک لمحے میں صحابہ کے دلوں سے خوف کو نکال دیا اور ان کے اندر نیا حوصلہ اور اعتماد پیدا کر دیا۔

نبی کریم ﷺ کی قیادت میں امید اور حوصلہ افزائی کا یہ پہلو بار بار نظر آتا ہے۔ جب آپ ﷺ نے کہا: "ان شاءاللہ یہ سب کل ہم مسلمانوں کا مال غنیمت ہوں گے!" تو یہ الفاظ دراصل اسلامی قیادت کی ایک بہترین مثال ہیں، جو افراد کو مستقبل کی کامیابی کے لیے تیار کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے صحابہ کو یہ یقین دلایا کہ اگرچہ دشمن تعداد اور ساز و سامان میں زیادہ معلوم ہوتا ہے، لیکن فتح اور کامیابی مسلمانوں کے حصے میں آئے گی۔

یہ الفاظ سن کر صحابہ کرام میں جوش و ولولہ پیدا ہوا، ان کے دل مضبوط ہو گئے اور وہ پورے اعتماد کے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ اسی طرح حضرت انس بن ابو مرثد رضی اللہ عنہ نے نہ صرف ایک مشکل ذمہ داری کو بخوشی قبول کیا بلکہ اسے مکمل ایمان داری اور اخلاص کے ساتھ نبھایا۔ نبی کریم ﷺ کے ایک جملے نے ان کے اندر اتنی ہمت اور جذبہ پیدا کر دیا کہ وہ پوری رات پہرہ دیتے رہے، اور کسی لمحے بھی آرام نہ کیا، سوائے نماز پڑھنے یا ضرورت پوری کرنے کے۔

ہمارے معاشرے میں عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ بڑے افراد نوجوانوں کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں، ان کے خوابوں کو غیر عملی قرار دیتے ہیں اور انہیں اہم ذمہ داریاں دینے سے گریز کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نوجوان خود اعتمادی سے محروم ہو جاتے ہیں اور معاشرے میں کوئی بڑا کردار ادا نہیں کر پاتے۔ اس کے برعکس، نبی کریم ﷺ کی قیادت میں ہر صحابی کو امید، خود اعتمادی اور قیادت کے مواقع ملے، جس کی بدولت وہ عظیم شخصیات بن گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر

صحابی نے تاریخ میں ایسا مقام بنایا جو آج تک روشن ہے۔ یہ سب نبی کریم ﷺ کے اس تربیتی انداز کا نتیجہ تھا جس میں امید، حوصلہ اور خوشی کا بھرپور اظہار شامل تھا۔

2. اجتہاد کی حوصلہ افزائی

اجتہاد کسی بھی معاشرے کی علمی اور فکری ترقی کے لیے نہایت اہم ہے۔ وہ معاشرے جو اجتہاد اور غور و فکر کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، ہمیشہ ترقی کی راہ پر گامزن رہتے ہیں، جبکہ وہ معاشرے جہاں سوچ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں، جمود اور زوال کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اسلام نے تقلیدِ محض کے بجائے اجتہاد اور تحقیق پر زور دیا ہے، تاکہ ہر دور میں امت کو درپیش چیلنجز کا حل نکالا جا سکے۔

نبی کریم ﷺ کی قیادت میں ایک ایسا ماحول تشکیل پایا، جہاں سوچنے، سمجھنے اور شرعی اصولوں کی روشنی میں مسائل کا حل نکالنے کی آزادی دی گئی۔ آپ ﷺ صحابہ کرام کو فکری خود مختاری دیتے، ان کی سوچنے کی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتے اور جب بھی کسی نے اجتہادی کوشش کی، تو آپ ﷺ اسے سراہتے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام میں ایسے عظیم فقہاء اور مجتہدین پیدا ہوئے، جنہوں نے اجتہاد کی بنیاد پر امت کی علمی ترقی میں لازوال کردار ادا کیا۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: "غزوہ ذات السلاسل کے دوران ایک رات مجھے احتلام ہو گیا، اور موسم نہایت سرد تھا۔ میں نے غسل کرنے کے بجائے تیمم کیا اور اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھائی۔ جب یہ بات نبی کریم ﷺ تک پہنچی، تو آپ ﷺ نے پوچھا: 'عمرو! تم نے اپنی قوم کو حالتِ جنابت میں نماز پڑھائی؟' میں نے عرض کیا: 'یا رسول اللہ! مجھے غسل کے نتیجے میں ہلاکت کا اندیشہ تھا، اور میں نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سنا: ﴿وَلَا تَقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا﴾ (النساء: 29) [اور اپنی جانوں کو ہلاک نہ کرو، بے شک اللہ تم پر مہربان ہے]، اس لیے میں نے تیمم کر کے نماز پڑھائی۔' **نبی کریم ﷺ یہ سن کر مسکرا دیے اور خاموش رہے۔**"[6] (ابو داؤد)

یہ حدیث صرف اجتہاد کی اجازت پر دلالت نہیں کرتی، بلکہ نبی کریم ﷺ کے مخصوص اندازِ تائید کو بھی اجاگر کرتی ہے۔ عام طور پر نبی کریم ﷺ جب کسی چیز کو خاموشی سے قبول فرماتے، تو اسے "اقرارِ نبوی" کہا جاتا، یعنی آپ ﷺ کا سکوت اس بات کی دلیل ہوتا کہ وہ عمل جائز اور مقبول ہے۔ مگر یہاں معاملہ بالکل منفرد ہے۔ آپ ﷺ خاموش ہی نہیں رہے، بلکہ تبسم فرمایا، مسکرائے!

یہ تبسم دراصل اس بات کی علامت تھا کہ نہ صرف حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا اجتہاد درست تھا، بلکہ **نبی کریم ﷺ اس اجتہادی صلاحیت کو پسند بھی فرما رہے تھے۔** یہ خوشی دراصل ایک امت کی تعمیر کی خوشی تھی، وہ امت جو ہمیشہ کے لیے اجتہاد کو اپنا ہتھیار بنائے گی، وہ امت جس میں تقلید کے ساتھ ساتھ تحقیق بھی ہو گی، اور وہ امت جس میں ہر زمانے کے مطابق شرعی مسائل کے حل نکالنے کی صلاحیت پیدا ہو گی۔

ایک عام سوچ یہ ہو سکتی تھی کہ نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں کسی صحابی کو اپنے طور پر اجتہاد نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ وہ تو خود نبی کریم ﷺ سے براہِ راست رہنمائی لے سکتے تھے۔ مگر نبی کریم ﷺ کا مشن صرف اپنی زندگی تک محدود نہ تھا۔ آپ ﷺ کو ایک ایسی امت تیار کرنی تھی جو آپ ﷺ کے بعد بھی دین کی رہنمائی کے قابل ہو۔

اس کے لیے سب سے بہترین طریقہ یہی تھا کہ صحابہ کو نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں ہی سوچنے، غور و فکر کرنے اور فیصلے لینے کی آزادی دی جائے، تاکہ وہ غلطیاں کریں، سیکھیں، اور نبوی اصلاح کے زیرِ سایہ اپنی اجتہادی صلاحیتوں کو نکھار سکیں۔ **اگر نبی کریم ﷺ کی حیات میں ان کی اجتہادی صلاحیتیں پروان نہ چڑھتیں، تو بعد میں ان کے پاس غلطی کی گنجائش نہ ہوتی۔** اس لیے نبی کریم ﷺ نے انہیں خود سے فیصلے لینے کی اجازت دی، اور جب ان کا فیصلہ درست ہوتا، تو آپ ﷺ مسکرا کر ان کی حوصلہ افزائی کرتے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے میں اکثر **نئے خیالات کو دبایا جاتا ہے**، بچوں اور نوجوانوں کو روایتی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور جو شخص کچھ نیا سوچے، وہ ملامت اور تنقید کا نشانہ بنتا ہے۔ یہی وہ رویہ ہے جو تخلیقی صلاحیتوں کو ختم کر دیتا ہے، اجتہاد کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے، اور معاشرے کو جمود میں مبتلا کر دیتا ہے۔ **لیکن نبی کریم ﷺ کا طریقہ اس سے بالکل برعکس تھا۔** آپ ﷺ نے ہر اجتہادی کوشش کو سراہا، اور اپنے تبسم، اور چند مسکراہٹوں، اور کبھی کبھار قہقہے کے ذریعے امت کو اجتہاد جیسے قیمتی تحفے سے نوازا اور ایک ایسی امت کی بنیاد رکھی جو نہ صرف دین کو محفوظ رکھے گی، بلکہ ہر دور کے چیلنجز کا حل بھی نکالے گی۔

نبی کریم ﷺ کے اس رویے کا نتیجہ یہ نکلا کہ صحابہ کرام میں فقہ اور اجتہاد کا ایسا ماحول پیدا ہوا جو بعد میں اسلامی تہذیب کی بنیاد بنا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں اجتہاد کو ایک منظم اصولی طریقے سے اپنایا گیا۔ فقہاء صحابہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت زید بن ثابت، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر مجتہدین پیدا ہوئے۔

یہ سب اسی تبسم کی برکت تھی، وہ مسکراہٹ جو نبی کریم ﷺ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے اجتہاد پر فرمائی تھی۔ وہ مسکراہٹ دراصل ایک پیغام تھی کہ **"سوچو، غور کرو، سمجھو، اور دین کی روشنی میں فیصلے کرو!"** اگر یہ مسکراہٹ نہ ہوتی، تو شاید اسلام بھی ان جامد مذاہب کی طرح بن جاتا جہاں کسی نئے مسئلے پر غور کرنا ممنوع سمجھا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی قیادت میں اجتہاد اور تحقیق کی بنیاد رکھی گئی، تاکہ امت ہمیشہ متحرک اور ترقی یافتہ رہے۔ آپ ﷺ کے تبسم نے اس بات کو واضح کر دیا کہ اجتہاد امت کی علمی اور فقہی ترقی کے لیے ضروری ہے۔

3. بین الاقوامی تعلقات

کسی بھی مستحکم اور ترقی یافتہ معاشرے کے لیے ضروری ہے کہ وہ دیگر اقوام، مذاہب، اور نظریات کے حامل افراد کے ساتھ متوازن اور باوقار تعلقات استوار کرے۔ بین الاقوامی تعلقات میں حکمت، رواداری، اور حسنِ سلوک ایک مہذب قوم کی پہچان ہوتے ہیں۔ وہ معاشرے جو دوسرے مذاہب اور اقوام کے ساتھ مثبت انداز میں تعامل کرتے ہیں، وہ ترقی اور استحکام کی راہ پر گامزن رہتے ہیں، جبکہ تعصب، شدت پسندی، اور غیر ضروری سختی معاشرتی زوال اور انتشار کا سبب بنتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ ہمیں سکھاتی ہے کہ بین الاقوامی تعلقات میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ خوش اخلاقی، نرمی، اور مسکراہٹ کا بھی ایک اہم کردار ہے۔ آپ ﷺ نے حکمت اور دانشمندی کے ساتھ غیر مسلم اقوام سے تعلقات قائم کیے، اور جب بھی کہیں کسی دوسری قوم کے فرد نے کوئی حق بات کی، تو آپ ﷺ نے اسے انا یا ضد کا مسئلہ

نہیں بنایا، بلکہ کھلے دل سے قبول کیا۔ یہی وہ طرزِ عمل تھا، جس نے اسلام کی سچائی کو لوگوں کے دلوں تک پہنچایا اور دنیا میں دین کے پیغام کو عام کیا۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: "نبی کریم ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن زمین ایک روٹی کی مانند ہوگی، جسے اللہ تعالیٰ اپنے ہاتھوں سے پلٹے گا، جیسے تم میں سے کوئی شخص اپنے سفر میں روٹی پلٹتا ہے، تاکہ یہ جنتیوں کی مہمانی کے لیے تیار ہو جائے۔ ایک یہودی آیا اور کہنے لگا: اے ابو القاسم! کیا میں تمہیں جنتیوں کی ضیافت کے متعلق نہ بتاؤں؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کیوں نہیں۔ اس نے کہا: قیامت کے دن زمین ایک بڑی روٹی کی مانند ہوگی، جیسا کہ آپ نے فرمایا، پھر نبی کریم ﷺ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور **ہنس پڑے یہاں تک کہ آپ کے دندانِ مبارک ظاہر ہو گئے**، اور فرمایا: کیا میں تمہیں جنتیوں کے سالن کے بارے میں نہ بتاؤں؟ صحابہ نے کہا: کیوں نہیں، یا رسول اللہ! تو آپ ﷺ نے فرمایا: ان کا سالن بیل اور مچھلی کا ہوگا، جس کی زائد چربی کے حصے کو ستر ہزار لوگ کھائیں گے۔"[7] (بخاری)

یہاں ہمیں نبی کریم ﷺ کا ایک منفرد پہلو نظر آتا ہے۔ عام طور پر آپ ﷺ مسکرا دیتے تھے، مگر کسی موقع پر ہنسی کے دوران آپ کے دندانِ مبارک نمایاں ہو جانا ایک غیر معمولی کیفیت تھی۔ اس حدیث میں خاص طور پر بیان کیا گیا کہ آپ ﷺ اتنے خوش ہوئے کہ آپ کے دانت نظر آنے لگے۔

یہ ظاہر کرتا ہے کہ **یہ معاملہ آپ ﷺ کے لیے ایک حساس اور اہم مسئلہ تھا، جسے آپ ﷺ امت کی تربیت کے لیے جڑ سے ختم کرنا چاہتے تھے**۔ عام طور پر لوگ اپنی دینی اور علمی برتری کے زعم میں کسی اور کی حق بات کو بھی مسترد کر دیتے ہیں، اور اگر کوئی مختلف مذہب کا شخص کوئی درست بات کرے، تو اسے قبول کرنا توہین سمجھا جاتا ہے۔ یہ مسئلہ اگر اس وقت ختم نہ کیا جاتا، تو بعد میں صحابہ بھی کسی غیر مسلم کی سچی بات کو رد کرنے لگتے، اور یہ روش امت میں شدت پسندی کو فروغ دے سکتی تھی۔ نبی کریم ﷺ کی یہ **نمایاں مسکراہٹ اور کھل کر ہنسنا** دراصل صحابہ کے دلوں میں ایک مضبوط پیغام ثبت کرنے کے لیے تھا، تاکہ وہ آئندہ ہر سچ بات کو، چاہے وہ کسی سے بھی آئے، تسلیم کرنے کے اصول کو اپنا لیں۔

یہی وہ اصول تھا، جس نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں **بردباری، علمی وسعت، اور بین الاقوامی معاملات میں حکمت کی بنیاد رکھی**۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں اسلامی خلافت نے دیگر اقوام کے ساتھ نہایت منصفانہ اور حکمت بھرا تعامل کیا، اور مسلمانوں نے علم و سیاست کے میدان میں دنیا کی رہنمائی کی۔ نبی کریم ﷺ کے تبسم کا سب سے بڑا اثر یہ تھا کہ **صحابہ نے سچائی کو قبول کرنے کی عادت اپنائی اور جذباتیت کے بجائے عقل اور حکمت کے مطابق معاملات کو پرکھنے کا اصول اپنایا**۔ یہی وجہ تھی کہ جب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی عالم سے بعض فقہی مسائل پر گفتگو کی، تو انہوں نے اسے پورے ادب سے سنا اور جہاں حق بات محسوس کی، اسے قبول کیا۔ یہی حکمت ان کے بعد آنے والے فقہاء میں بھی نظر آتی ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور دیگر ائمہ نے بھی فقہ میں وسعت اختیار کی اور مختلف ذرائع سے علم کو پرکھا۔ یہ سب اسی تربیت کا نتیجہ تھا جو نبی کریم ﷺ نے اپنے تبسم، نرمی، اور حقیقت پسندی کے ذریعے صحابہ کو دی۔

یہ حدیث ہمیں ایک وسیع تر پیغام دیتی ہے کہ بین الاقوامی تعلقات میں **ذاتی انا اور تعصب کو ختم کرنا ضروری ہے**۔ اگر نبی کریم ﷺ اس یہودی کی بات کو انا کا مسئلہ بنا لیتے، یا اس سے بحث کرتے، تو یہ ایک منفی تاثر پیدا ہو سکتا تھا۔ مگر آپ ﷺ نے کھلے دل سے سچائی کو تسلیم کیا اور اپنی خوشی کا اظہار فرمایا۔

یہ رویہ آج کے امت مسلمہ کے لیے بھی ایک بڑی نصیحت ہے۔ ہمارے معاشرے میں مختلف مذاہب اور مکاتبِ فکر کے درمیان اتنا زیادہ تعصب پایا جاتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کی درست بات کو بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ **ہم اختلافِ رائے کو دشمنی میں بدل دیتے ہیں، اور اپنی ضد اور انا کی تسکین کے لیے ہر چیز کو مذہب کے نام پر پیش کر دیتے ہیں۔** آج ہمارا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ ہم **"اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے بغض"** کے اصول پر عمل کرنے کے بجائے اپنی ذاتی انا اور تعصبات کی بنیاد پر محبت اور نفرت کرتے ہیں، اور پھر اس پر مذہب کا لبادہ چڑھا دیتے ہیں۔ ہم کسی دوسرے فرقے یا مذہب کے فرد کی بات کو سچ ماننے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے، چاہے وہ حقائق پر مبنی ہی کیوں نہ ہو، اور نہ ہی ہم ان سے محبت و شفقت کا برتاؤ روا رکھتے ہیں۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اگرچہ نبی کریم ﷺ اور یہودیوں کے درمیان جنگیں بھی ہوئیں، معاہدے بھی ہوئے، اور مختلف مواقع پر کشیدگی بھی پیدا ہوئی، مگر اس کے باوجود آپ ﷺ نے ہر موقع پر **حکمت** کو پیشِ نظر رکھا۔ آپ ﷺ نے ہر وقت ایک ہی رویہ نہیں اپنایا، بلکہ **حالات اور مصلحتوں کے مطابق معاملہ فرمایا۔** یہی وجہ ہے کہ فتح الباری میں اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے کہا گیا": نبی کریم ﷺ کا ہنسنا اس بات کی دلیل تھا کہ انہیں یہودی کا اپنی کتاب سے وہی بات بیان کرنا پسند آیا جو وحی کے ذریعے آپ پر نازل کی گئی تھی، اور نبی کریم ﷺ کو یہ بہت محبوب تھا کہ اہلِ کتاب کی تائید ایسی باتوں میں ہو جن کے بارے میں آپ پر وحی نازل ہوئی ہو۔"[8] (فتح الباری) اسی طرح شرح صحیح مسلم میں اس حدیث کے بارے میں لکھا گیا: "اس حدیث میں اس بات کا اشارہ ہے کہ حق بات کو ہر اس شخص سے قبول کر لینا چاہیے جو اسے بیان کرے، چاہے وہ یہودی ہی کیوں نہ ہو۔"[9] (شرح صحیح مسلم، حسن الاشبال)

نبی کریم ﷺ کی یہ حکمتِ عملی آج کے بین الاقوامی تعلقات کے لیے بھی ایک بہترین مثال ہے۔ اگر امتِ مسلمہ دیگر اقوام کے ساتھ مکالمے، حسنِ سلوک، اور نرم رویے کو اپنائے، تو اسلام کی اصل تعلیمات زیادہ مؤثر انداز میں دنیا کے سامنے آ سکتی ہیں۔

یہ حدیث ہمیں یہ سبق بھی دیتی ہے کہ مختلف مذاہب اور اقوام کے ساتھ تعلقات میں شدت پسندی اور سختی کے بجائے نرمی، برداشت، اور حکمت سے کام لینا چاہیے۔ اگر ہم صرف اپنے جذبات کے تحت لوگوں سے نفرت کریں، یا صرف اپنی ضد اور انا کی تسکین کے لیے مذہب کا سہارا لیں، تو یہ رویہ نہ دین کی خدمت ہے اور نہ ہی امت کے لیے فائدہ مند۔

آپ ﷺ کا ہنسنا اور مسکرانا صرف ایک ظاہری اظہار نہیں تھا، بلکہ ایک **عمیق حکمت پر مبنی درس** تھا، جس کا مقصد صحابہ کے دلوں میں اس بات کو راسخ کرنا تھا کہ حق بات جہاں سے بھی آئے، اسے قبول کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہونی چاہیے۔ اگر ہم اس اصول کو اپنائیں، تو ہم دنیا میں اسلام کی اصل تصویر کو بہتر انداز میں پیش کر سکتے ہیں اور ایک ایسی امت کی تشکیل کر سکتے ہیں جو حکمت، انصاف، اور رواداری کی بنیاد پر مضبوط ہو۔

4. لوگوں سے ان کے درجات کے مطابق تعامل

معاشرتی استحکام، عدل، اور ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ہر فرد کے ساتھ اس کی صلاحیت، حیثیت، اور سماجی مرتبے کے مطابق برتاؤ کیا جائے۔ جب قیادت کسی قوم کے اثر و رسوخ رکھنے والے افراد کے ساتھ عزت و تکریم سے پیش آتی ہے، تو وہ نہ صرف خود اس قیادت کے وفادار ہو جاتے ہیں، بلکہ ان کی قوم بھی مثبت طور پر متاثر ہوتی ہے۔

نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ ہمیں یہی اصول سکھاتی ہے کہ قیادت میں ہر فرد کو اس کے درجے کے مطابق عزت دی جائے، تاکہ سماجی نظام توازن اور ہم آہنگی کے ساتھ ترقی کرے۔ آپ ﷺ خاص طور پر ان افراد کے ساتھ محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے، جو اپنی قوموں کے سردار اور قائد ہوتے، کیونکہ ان کے ذریعے پورے قبیلے اور برادری کو اسلام کے قریب لانے میں مدد مل سکتی تھی۔

حضرت جریر بن عبد اللہ البجلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: "جب سے میں اسلام لایا، رسول اللہ ﷺ نے کبھی مجھے اپنے دروازے پر انتظار نہیں کروایا اور جب بھی مجھے دیکھتے تو میرے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دیتے۔" (بخاری)[10]

یہ روایت نبی کریم ﷺ کی **جامعیت (Inclusivity)** اور **قیادتی بصیرت** کو ظاہر کرتی ہے۔ حضرت جریر رضی اللہ عنہ **قبیلہ بجیلہ کے سردار** تھے، جو یمن کے مشہور قبائل میں سے ایک تھا۔ وہ ایک بااثر شخصیت کے حامل تھے، اور جب وہ اپنے قبیلے سمیت اسلام میں داخل ہوئے، تو نبی کریم ﷺ نے ان کے ساتھ خصوصی شفقت کا معاملہ فرمایا۔ **یہاں ایک اہم بات یہ ہے کہ حضرت جریر رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے بعد اسلام لائے اور نبی کریم ﷺ کی وفات سے کچھ ہی عرصہ پہلے ایمان لانے والوں میں شامل تھے۔** اس کے باوجود، نبی کریم ﷺ نے ان کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کیا جیسے وہ ہمیشہ سے امت کا حصہ رہے ہوں۔ نبی کریم ﷺ کا ان کے ساتھ ہمیشہ مسکرا کر پیش آنا در حقیقت قیادت کے اس اصول کی وضاحت کرتا ہے کہ ایک قوم کے سردار کے ساتھ حسنِ سلوک پوری قوم کے دل جیتنے کا بہترین ذریعہ ہوتا ہے۔

یہ مسکراہٹ ایک عام مسکراہٹ نہ تھی، بلکہ **قیادت کی طرف سے عزت افزائی کا ایک انداز تھا۔** یہی وجہ ہے کہ شرح النووی میں ذکر ہوا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا یہ اکرام، لطف، اور بشاشت کا اظہار تھا، اور یہ قیادت کے لیے ایک اہم اصول ہے کہ نئے شامل ہونے والوں کو گرم جوشی کے ساتھ خوش آمدید کہا جائے[11]۔ اسی طرح ابن بطال نے شرح صحیح بخاری میں ذکر کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا رویہ ظاہر کرتا ہے کہ ایک معزز شخص کو اس کے مقام کے مطابق عزت دینا ضروری ہے، اور مسکراہٹ، طلاقۃ الوجہ (روشن چہرہ)، اور تواضع قیادت کے لازمی اصول ہیں[12]۔

یہاں ایک اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صرف مسکراہٹ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ ﷺ حضرت جریر رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر باقاعدہ ہنسے بھی، جس کا مطلب یہ ہے کہ **یہ محض رسمی خوشی نہ تھی بلکہ ایک گہری حکمت پر مبنی مسرت تھی، تاکہ حضرت جریر رضی اللہ عنہ کے دل میں مزید محبت اور اعتماد پیدا ہو۔**

یہ نبی کریم ﷺ کے تربیتی انداز کا بھی حصہ تھا، کیونکہ دیگر صحابہ بھی دیکھ رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ کس طرح ایک نئے مسلمان اور ایک سردار کو عزت دے رہے ہیں، تاکہ وہ بھی سیکھیں کہ قیادت کیسے کی جاتی ہے۔

حضرت جریر رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ نے **ایک خاص مشن پر بھیجا، یعنی ذوالخلصہ (یمن کے ایک بڑے بت) کو ختم کرنے کے لیے۔** "نبی کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا: 'اے جریر! کیا تم مجھے ذوالخلصہ سے نجات نہیں دلاؤ گے؟' میں نے فوراً اس ذمہ داری کو قبول کیا۔ لیکن میں گھڑ سواری میں ماہر نہ تھا، لہذا میں نے نبی کریم ﷺ سے اس کا ذکر کیا۔ آپ ﷺ نے اپنا مبارک ہاتھ میرے سینے پر مارا اور دعا دی: 'اے اللہ! اسے ثابت قدم بنا اور ہدایت دینے والا اور ہدایت پانے والا بنا۔' پھر میں اپنے قبیلے کے ایک سو پچاس سواروں کے ساتھ روانہ ہوا اور اس بت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔"[13] (مسلم)

یہاں نبی کریم ﷺ کے **قیادتی اصولوں کا عروج نظر آتا ہے۔ آپ** ﷺ نے حضرت جریر رضی اللہ عنہ کو نہ صرف عزت دی، بلکہ انہیں ایک عظیم مشن پر بھی بھیجا اور عملی طور پر ان کی قیادت کو پروان چڑھایا۔ یہ ایک بے مثال قیادتی حکمت عملی تھی، جہاں ایک نیا مسلمان ہونے کے باوجود حضرت جریر رضی اللہ عنہ کو ایسا محسوس کروایا گیا کہ وہ اسلام کے اہم ستونوں میں سے ایک ہیں۔ اسی روایت میں آتا ہے کہ جب حضرت جریر رضی اللہ عنہ کے بھیجے ہوئے نمائندے نے کامیابی کی خبر دی، تو نبی کریم ﷺ نے **خوش ہو کر قبیلہ احمس (جریر کے قبیلے) کے گھوڑوں اور سپاہیوں کے لیے پانچ مرتبہ دعا کی۔** یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ **کسی ایک فرد کو عزت دینے کے ذریعے پورے معاشرے پر اثر انداز ہوتے تھے۔**

یہ حکمتِ قیادت آج کے لیے بھی ایک بڑا درس رکھتی ہے۔ جب کوئی نیا فرد کسی جماعت، ادارے، یا قوم میں شامل ہو، تو اسے اجنبیت محسوس نہ ہونے دی جائے، بلکہ ایسا ماحول دیا جائے کہ وہ خود کو ایک اہم حصہ سمجھے۔ جو افراد کسی قوم، قبیلے، یا برادری کے سربراہ ہوں، ان کے ساتھ خصوصی محبت اور عزت کا رویہ اختیار کیا جائے، کیونکہ وہ اپنی قوم کے نمائندے ہوتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت جریر رضی اللہ عنہ کو صرف ایک صحابی کی حیثیت سے نہیں دیکھا، بلکہ انہیں ایک **مستقبل کے لیڈر** کے طور پر تیار کیا، اور اس قیادت کو عملی مشن سونپ کر پروان چڑھایا۔ **قیادت کو لوگوں کی کمزوریوں کو طاقت میں بدلنے کا ہنر آنا چاہیے** — حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے جب اپنی گھڑ سواری کی کمزوری کا ذکر کیا، تو نبی کریم ﷺ نے سرزنش کے بجائے **دعا دی اور انہیں ہمت دی۔**

نبی کریم ﷺ کا طرزِ عمل ہمیں سکھاتا ہے کہ قیادت میں محبت، عزت، اور حکمت سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ جب ایک قائد کسی فرد کو اس کے مقام کے مطابق عزت دیتا ہے، تو وہ اپنی پوری صلاحیت کے ساتھ کھل کر ترقی کرتا ہے۔ اگر ہم نبی کریم ﷺ کے اس اصول کو آج کے دور میں اپنائیں، تو ہم ایک ایسے سماج کی تشکیل کر سکتے ہیں جہاں ہر فرد خود کو اہم، مفید، اور مؤثر محسوس کرے، اور یہی کسی بھی معاشرے کی کامیابی کی اصل کنجی ہے۔

انفرادی اثرات

1. شخص کی فطری طبع کے اظہار پر خوشی

ہر انسان کی فطرت میں کچھ ایسے بنیادی جذبات اور عادات ہوتی ہیں جو اس کی شخصیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اگر ان جذبات کو متوازن انداز میں ظاہر ہونے دیا جائے، تو فرد میں خود اعتمادی اور ذہنی سکون پیدا ہوتا ہے، اور وہ

اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے ایک مضبوط شخصیت میں ڈھلتا ہے۔ لیکن اگر ان جذبات کو دبایا جائے، تو انسان کا اعتماد متزلزل ہو جاتا ہے، وہ خود پر شک کرنے لگتا ہے، اور بالآخر اس کی شخصیت دھندلا جاتی ہے۔ خاص طور پر نوجوانوں کے جذبات اگر صحیح انداز میں اظہار کا موقع نہ پائیں، تو وہ یا تو اندر ہی اندر گھٹنے لگتے ہیں یا پھر کسی منفی پہلو میں شدت اختیار کر لیتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی سیرت ہمیں یہی سکھاتی ہے کہ ہر فرد کو اس کے مزاج کے مطابق اپنی شخصیت کو نکھارنے کا موقع دیا جائے۔ آپ ﷺ کی تربیت کا خاص پہلو یہ تھا کہ آپ نے افراد کو ہمیشہ آزادانہ اظہار کا موقع دیا، ان کے فطری رجحانات کو دبانے کے بجائے ان کی حوصلہ افزائی کی، اور انہیں وہ اعتماد بخشا جس کی بنیاد پر وہ ایک مستحکم شخصیت میں ڈھل سکے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کا مطالعہ کرتے ہیں، تو ہمیں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں جہاں آپ ﷺ نے صحابہ کو اپنی فطرت کے مطابق عمل کرنے دیا، بجائے اس کے کہ ان پر کسی مخصوص سانچے کا جبر کیا جائے۔

یہی اصول ہمیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نبی کریم ﷺ کے رویے میں نظر آتا ہے۔ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: "مجھے معلوم نہیں تھا کہ زینب بغیر اجازت میرے پاس آگئی ہیں، وہ سخت غصے میں تھیں اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے کہنے لگیں: 'یارسول اللہ! آپ کے لیے یہ کافی ہے کہ ابو بکر کی بچی آپ کے سامنے ننھے ننھے بازو ہلاتی ہے؟' میں نے انہیں جواب دینا چاہا، لیکن میں نے رک جانا بہتر سمجھا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: 'عائشہ! تم بھی جواب دو۔' میں نے زینب کو ایسی باتیں سنائیں کہ وہ بالکل خاموش ہو گئیں اور ان کا منہ خشک ہو گیا۔ پھر میں نے نبی کریم ﷺ کے چہرہ انور کو دیکھا، تو وہ **خوشی سے جگمگا رہا تھا۔** "[14] (ابوداؤد)

یہ واقعہ ہمیں نبی کریم ﷺ کی گہری بصیرت اور افراد کے ساتھ آپ ﷺ کے رویے کی حکمت سکھاتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس وقت نوجوان تھیں، ان کا مزاج ذہین، جرات مند، اور تیز فہم تھا۔ ان کی طبیعت میں جوش بھی تھا اور بے ساختگی بھی۔ عام طور پر ایک استاد یا سرپرست ایسے مواقع پر فوری طور پر مداخلت کر کے جذبات کو روکنے کی کوشش کرتا ہے، مگر نبی کریم ﷺ نے ایسا نہیں کیا۔

یہاں ایک عام تصور یہی ہو سکتا تھا کہ نبی کریم ﷺ دونوں کو خاموش کروا دیتے، معاملے کو خود سنبھال لیتے، یا انہیں نرمی اور صبر کی تلقین فرماتے۔ لیکن حیران کن طور پر، آپ ﷺ نے نہ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو روکا اور نہ ہی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو، بلکہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پہلے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاموش رہیں، تو آپ ﷺ نے انہیں خود جواب دینے کی ترغیب دی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ چاہتے تھے کہ افراد اپنے دفاع میں بولنے، اپنی رائے کے اظہار، اور اپنے فطری رجحانات کے مطابق زندگی گزارنے کی ہمت رکھیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مدلل اور پرزور جواب سننے کے بعد، نبی کریم ﷺ خوش ہوئے اور آپ ﷺ کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ **یہ محض ایک عام مسکراہٹ نہ تھی، بلکہ آپ ﷺ کی قیادت کی گہری حکمت کا حصہ تھی۔**

یہ وہ مسکراہٹ تھی جو کسی کی فطری صلاحیت کو تسلیم کرنے اور اس کی خود اعتمادی کی توثیق کرنے کے لیے دی جاتی ہے۔ مرشد ذوی الحجا میں اس بات کو یوں بیان کیا گیا: "میں نے نبی کریم ﷺ کا چہرہ دیکھا، وہ چودھویں کے چاند کی

طرح چمک رہا تھا، کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے زینب کو خاموش کر دیا تھا، اور یہ آپ ﷺ کے لیے باعثِ خوشی تھا۔"[15] **نبی کریم ﷺ کی یہ خوشی اس بات کی علامت تھی کہ جب کوئی فرد اپنی فطری صلاحیت کے ساتھ عمل کرتا ہے، تو اس کی قدر کی جانی چاہیے۔** یہی وجہ ہے کہ طرح التثریب میں ذکر ہوا کہ: "نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو جواب دینے کی اجازت دے کر ان کے اندر خود اعتمادی کو مزید مضبوط کیا، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کی شخصیت میں ایک منفرد جرات مندی اور ذہانت موجود ہے، اور اس کی حوصلہ افزائی ضروری ہے۔"[16]

یہاں نبی کریم ﷺ کا ایک اور قابل غور پہلو یہ تھا کہ آپ ﷺ نے اس بحث میں غیر ضروری مداخلت نہیں کی۔ آپ ﷺ نے نہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو زبردستی نرمی اختیار کرنے کا کہا، اور نہ ہی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو روک دیا، بلکہ آپ ﷺ نے انہیں خود اس معاملے کو نمٹانے دیا۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ افراد کو آزاد چھوڑ کر انہیں خود اپنی صلاحیتوں کے مطابق پرورش پانے کا موقع دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ابوالعباس القرطبیؒ نے فرمایا: "یہاں نبی کریم ﷺ کا طرزِ عمل اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ہر فرد کو اس کے جذبات کے مطابق ردعمل دینے کا موقع دینا چاہیے، تاکہ وہ ذہنی دباؤ کا شکار نہ ہو، اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھ سکے۔"[17]

یہی اصول آج بھی نوجوانوں کی تربیت میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر نوجوانوں کو اپنی فطری شخصیت کے مطابق اظہارِ خیال کا موقع نہ دیا جائے، تو وہ یا تو دب کر اپنی شناخت کھو دیتے ہیں، یا پھر جذباتی طور پر باغی ہو جاتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے اس بات کو سمجھتے ہوئے ہمیشہ افراد کو وہ ماحول فراہم کیا جہاں وہ اپنی اصل شخصیت کے ساتھ جیتے اور سیکھتے۔

یہ واقعہ ہمیں سکھاتا ہے کہ **اسلام افراد کی فطری طبیعت کو تسلیم کرتا ہے اور انہیں اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کا موقع دیتا ہے۔** نبی کریم ﷺ کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے جواب پر خوش ہونا اور مسکرانا **اس بات کی علامت ہے کہ قیادت کا اصل کمال یہی ہے کہ وہ افراد کو ان کے فطری رجحانات کے مطابق پروان چڑھنے دے، بجائے اس کے کہ انہیں کسی مخصوص سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے۔**

یہ اصول خاص طور پر نوجوانوں کے لیے اہم ہے۔ اگر انہیں اظہارِ خیال، دفاع، اور جذبات کے متوازن اظہار کا موقع نہ دیا جائے، تو وہ یا تو بے اعتمادی کا شکار ہو جاتے ہیں، یا شدت پسند رویہ اپنا لیتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا طرزِ عمل ہمیں سکھاتا ہے کہ ہر فرد کی شخصیت کو سمجھنا، اس کی انفرادیت کی قدر کرنا، اور اسے اس کے جذبات کے اظہار کا موقع دینا **ایک کامیاب اور مثبت معاشرتی نظام کے لیے ناگزیر ہے۔**

2. فرد کی صلاحیت میں نکھار

کسی بھی معاشرے میں افراد کی صلاحیتوں کو نکھارنا اور ان کی قابلیت کو اجاگر کرنا ترقی اور استحکام کی بنیاد ہے۔ اگر کسی شخص کو اس کی فطری صلاحیتوں کے مطابق سیکھنے، سمجھنے، اور آگے بڑھنے کے مواقع دیے جائیں، تو وہ ایک کارآمد فرد بن سکتا ہے، لیکن اگر اسے دبایا جائے یا اس کی حوصلہ شکنی کی جائے، تو نہ صرف وہ خود نقصان اٹھاتا ہے بلکہ پورا معاشرہ اس کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ میں ہمیں واضح طور پر نظر آتا ہے کہ آپ ﷺ نے ہر فرد کی انفرادی صلاحیت کو پہچانا اور اسے نکھارنے کے لیے نہایت حکمت کے ساتھ اقدامات کیے۔ آپ ﷺ کا اندازِ قیادت ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہر

شخص میں کچھ نہ کچھ خاصیت ہوتی ہے، اور ایک کامیاب رہنما وہی ہوتا ہے جو ان خوبیوں کو اجاگر کرے اور ان کی درست سمت میں رہنمائی کرے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی گفتگو اس حقیقت کو نمایاں کرتی ہے کہ کیسے نبی کریم ﷺ نے ان کی علمی استعداد کو نکھارا اور اسے مزید جلا بخشی۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: "رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: 'ابو المنذر! تمہارے پاس اللہ کی کتاب کی کون سی آیت سب سے عظیم ہے؟' میں نے کہا: 'اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں۔' آپ ﷺ نے دوبارہ پوچھا: 'ابو المنذر! تمہارے پاس کون سی آیت سب سے عظیم ہے؟' میں نے کہا: 'اللّٰہُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ' (آیت الکرسی)۔ آپ ﷺ نے میرا سینہ تھپتھپایا اور فرمایا: **'مبارک ہو تمہیں اے ابو المنذر! علم کی یہ دولت تمہیں نصیب ہوئی ہے۔'"**[18] (مسلم)

یہاں نبی کریم ﷺ کا اندازِ تربیت ایک منفرد حکمت کی نشاندہی کرتا ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے براہِ راست سوال کر کے انہیں سوچنے، غور کرنے، اور اپنی علمی بصیرت کو استعمال کرنے کا موقع دیا۔ حالانکہ آپ ﷺ خود اس سوال کا جواب جانتے تھے، لیکن آپ ﷺ چاہتے تھے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اپنی صلاحیت کا اظہار کریں اور خود اعتمادی حاصل کریں۔

یہی اصول تعلیم اور تربیت میں سب سے زیادہ مؤثر سمجھا جاتا ہے۔ جب ایک معلم یا رہنما اپنے شاگردوں سے سوال کرتا ہے اور انہیں اپنی رائے دینے کا موقع دیتا ہے، تو اس سے ان میں فکری ترقی اور خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ جب حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے صحیح جواب دیا، تو نبی کریم ﷺ نے خوش ہو کر ان کی تصدیق کی اور اپنے الفاظ اور عمل سے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے جواب پر خوشی کا اظہار کیا، ان کا سینہ تھپتھپایا، اور انہیں خصوصی دعا سے نوازا۔ یہ محض ایک عام مسرت کا اظہار نہیں تھا بلکہ **یہ ایک ایسی عزت افزائی تھی جو ان کے اندر مزید علمی ترقی اور خود اعتمادی کے لیے تحریک پیدا کرنے والی تھی۔**

یہاں تین بنیادی نکات نمایاں ہوتے ہیں:

1. نبی کریم ﷺ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی علمی صلاحیت کو تسلیم کیا اور اسے سراہا۔
2. آپ ﷺ نے محبت اور شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے سینے پر ہاتھ رکھا، جو عزت افزائی اور اپنائیت کی ایک علامت ہے۔
3. آپ ﷺ نے "لیھنک العلم" (مبارک ہو تمہیں اے ابو المنذر!) کہہ کر ان کی علمی کامیابی کو ایک بڑے مرتبے پر فائز کیا۔

یہاں "لیھنک العلم" کے الفاظ کا استعمال بہت گہری حکمت رکھتا ہے۔ عربی لغت کے مطابق، "لیھنک" کا مطلب صرف مبارکباد دینا نہیں بلکہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ علم کا حصول بغیر کسی مشقت کے ان کے نصیب میں آیا۔ شارحین حدیث نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ نبی کریم ﷺ کا یہ جملہ **"علم کے لیے مبارک ہو، تمہارے لیے آسانی ہو، اور تمہیں اس سے فائدہ حاصل ہو"** کے مفہوم کو سموئے ہوئے ہے۔[19] (دلیل الفالحین)

یہ خوشی کا اظہار اور عزت افزائی ایک عام لمحاتی خوشی نہ تھی بلکہ اس کا اثر حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی پوری زندگی پر ہوا۔ وہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد بھی علمِ قرآن کے سب سے بڑے ماہرین میں شمار ہوتے رہے، اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی ان کا علمی مرتبہ برقرار رہا۔ نبی کریم ﷺ کی جانب سے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی علمی قابلیت کی حوصلہ افزائی نے انہیں ایک عظیم قاری، مفسر، اور فقیہ بنایا۔ آپ ﷺ نے ایک لمحے میں انہیں عزت دی، لیکن اس عزت افزائی کا اثر ان کی پوری زندگی پر رہا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں، جب قرآن مجید کو باقاعدہ طور پر مرتب کرنے کا کام کیا جا رہا تھا، تو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو قراءتِ قرآن کے ماہر کے طور پر شامل کیا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے مشورہ لیتے، اور ان کے علمی مرتبے کو تسلیم کرتے تھے۔

شارحین حدیث نے اس حدیث کی روشنی میں بیان کیا ہے کہ **"اگر کسی میں صلاحیت ہو، تو رہنما کو چاہیے کہ وہ اس کا امتحان لے، تاکہ اس کا فضل لوگوں پر ظاہر ہو اور وہ اس سے مستفید ہو سکیں۔ "**[20] (المنہل العذب المورود) یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ کی جانب سے دی گئی ایک مسرت بھری حوصلہ افزائی صرف ایک لمحے کی بات نہ تھی، بلکہ اس کا اثر صدیوں تک باقی رہا، اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا علمی ورثہ آج بھی امت کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔

یہ واقعہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ کسی بھی معاشرے میں علمی ترقی اور فکری نشوونما کے لیے افراد کی صلاحیتوں کو پہچاننا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنا ضروری ہے۔ اگر ایک رہنما یا استاد اپنے شاگردوں کو موقع دے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کریں، تو وہ ایک قابل شخصیت بن سکتے ہیں۔

بدقسمتی سے، آج کے معاشرے میں ہم اکثر افراد کی صلاحیتوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں، یا ان کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ اپنی مکمل استعداد سے فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔ لیکن نبی کریم ﷺ کی سیرت ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ ہر انسان کے اندر کوئی نہ کوئی خوبی ہوتی ہے، اور اگر اسے صحیح وقت پر تسلیم کر کے اس کی حوصلہ افزائی کی جائے، تو وہ آگے چل کر ایک کارآمد شخصیت بن سکتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے سوال پوچھنا، ان کے صحیح جواب پر خوش ہونا، اور محبت کے ساتھ ان کی عزت افزائی کرنا ہمیں سکھاتا ہے کہ قیادت اور تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت عزت دینے اور حوصلہ بڑھانے کی ہے۔ اگر ہم اس اصول کو آج کے تعلیمی، سماجی، اور پیشہ ورانہ میدانوں میں اپنائیں، تو کئی افراد کی پوشیدہ صلاحیتیں اجاگر کی جا سکتی ہیں، جو کہ معاشرتی ترقی کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ثابت ہوں گی۔ نبی کریم ﷺ کا یہ طریقہ ہمیں بتاتا ہے کہ **ایک لمحے کی خوشی اور حوصلہ افزائی کسی فرد کی زندگی میں ایسا دیرپا اثر ڈال سکتی ہے، جو صدیوں تک جاری رہے۔**

3. روزمرہ کے تعامل میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ حسِ مزاح کی حوصلہ افزائی

انسانی زندگی میں سنجیدگی جتنی ضروری ہے، اتنا ہی ضروری خوش طبعی، اپنائیت، اور نرم رویہ بھی ہے۔ اگر حسِ مزاح اور تفریح کو مکمل طور پر نظرانداز کر دیا جائے، تو زندگی بوجھل، خشک اور غیر متوازن محسوس ہونے لگتی ہے۔ ایک

ایسا شخص جو اعتدال کے ساتھ مزاح کو اپنی زندگی کا حصہ بناتا ہے، نہ صرف خود پُر سکون اور متوازن رہتا ہے بلکہ اس کے ارد گرد کے لوگ بھی خوشی اور اپنائیت محسوس کرتے ہیں۔

آج کے معاشرے میں ایک دیندار شخص کو عام طور پر سخت گیر، خشک اور سنجیدہ سمجھا جاتا ہے، جو صرف دینی گفتگو کرتا ہے اور ہنسی مذاق یا تفریح کو ناپسند کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی لوگ، خصوصاً نوجوان، دینداری سے دور ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ اسے اپنی فطرت کے خلاف محسوس کرتے ہیں۔ لیکن نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ اس تصور کی مکمل نفی کرتی ہے۔ آپ ﷺ کی مجلس میں نہ صرف حکمت اور سنجیدگی ہوتی تھی بلکہ خوش طبعی، اپنائیت اور نرمی کا عنصر بھی شامل تھا۔

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: "رسول اللہ ﷺ جب فجر کی نماز ادا کر لیتے، تو اپنی جگہ بیٹھے رہتے یہاں تک کہ سورج طلوع ہو جاتا۔ اس دوران صحابہ آپ سے گفتگو کرتے، جاہلیت کے قصے سناتے اور اشعار پڑھتے، اور نبی کریم ﷺ تبسم فرماتے۔"[21] (مسلم)

یہ حدیث اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی مجلس میں صرف عبادات یا فقہی گفتگو ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ خوشگوار اور ہلکی پھلکی بات چیت بھی شامل ہوتی تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے ساتھ مکمل بے تکلفی محسوس کرتے تھے، اور ان کے لیے یہ ایک ایسا موقع ہوتا تھا جہاں وہ دلی سکون حاصل کرتے، خوشگوار ماحول میں بات چیت کرتے اور آپ ﷺ کے چہرہ مبارک پر تبسم دیکھ کر خوشی محسوس کرتے۔

یہ اصول آج کے معاشرتی اور خاندانی زندگی میں بھی نہایت اہم ہے۔ اگر ایک گھر کا سربراہ، استاد، یا قائد ہر وقت سختی اور سنجیدگی اختیار کرے، تو اس کے ماتحت افراد یا شاگرد دباؤ محسوس کرنے لگتے ہیں۔ لیکن اگر وہ موقع محل کے مطابق نرمی اور خوش طبعی سے کام لے، تو اس سے تعلقات مضبوط ہوتے ہیں اور افراد کو ایک ایسا ماحول میسر آتا ہے جہاں وہ کھل کر بات کر سکتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی خوش طبعی اور اعتدال پسندی صرف صحابہ تک محدود نہیں تھی بلکہ آپ ﷺ نے بچوں اور نوجوانوں کو بھی ایک خوشگوار اور متوازن ماحول فراہم کیا۔ ایک مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں عید کے دن ان کی سہیلیاں گانے گا رہی تھیں، اور نبی کریم ﷺ بھی موجود تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: "عید کے دن میرے پاس دو لڑکیاں دف بجا رہی تھیں اور بعاث کی جنگ کے اشعار گا رہی تھیں۔ نبی کریم ﷺ بھی موجود تھے اور وہ ان کو سن رہے تھے۔ اسی دوران حضرت عمر رضی اللہ عنہ اندر آئے، تو وہ لڑکیاں دف رکھ کر خاموش ہو گئیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: 'یہ کیا؟ رسول اللہ ﷺ کے گھر میں شیطانی آوازیں؟' نبی کریم ﷺ نے فرمایا: 'عمر! انہیں چھوڑ دو، یہ عید کا دن ہے۔'"[22] (بخاری)

یہ حدیث ہمیں کئی اہم سبق دیتی ہے:

1. **خوشی اور تفریح کی اجازت** — نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں عید کے دن تفریح ہو رہی تھی، اور آپ ﷺ نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا، بلکہ اسے برداشت فرمایا۔
2. **بچوں کو گھٹن کا شکار نہ بنانا** — جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سختی سے ٹوکا، تو نبی کریم ﷺ نے انہیں سمجھایا کہ یہ تفریح دین میں ممنوع نہیں ہے، خاص طور پر عید جیسے خوشی کے مواقع پر۔

3. **نرم رویہ اور اپنائیت** — نبی کریم ﷺ نے اپنے عمل سے یہ پیغام دیا کہ دین سختی اور جبر کا نام نہیں بلکہ فطری خوشی اور اعتدال کا بھی حامل ہے۔

یہی اصول آج کے معاشرے میں بھی لاگو ہوتا ہے۔ اگر دیندار افراد ہر وقت سختی اور روک ٹوک سے کام لیں، تو بچے اور نوجوان ان سے دور ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ ان کی فطری خوشیوں کو جگہ دیں اور ان کے جذبات کو سمجھیں، تو وہ دین سے محبت کرنے لگیں گے۔

نبی کریم ﷺ کی زندگی ہمیں یہ درس دیتی ہے کہ خوش طبعی اور نرمی، سنجیدہ زندگی کو متوازن رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ اگر زندگی میں صرف سنجیدگی اور سختی کو اپنا لیا جائے، تو اس سے بوجھل پن پیدا ہو سکتا ہے، جبکہ اگر حسِ مزاح کو حدود میں رہتے ہوئے شامل کر لیا جائے، تو یہ تعلقات میں بہتری، ذہنی سکون، اور سماجی ہم آہنگی پیدا کر سکتی ہے۔

اگر ہم آج کے معاشرے میں نبی کریم ﷺ کے اس اصول کو اپنائیں، تو ہم ایک ایسا ماحول بنا سکتے ہیں جہاں دین داری خشک اور سخت نہیں بلکہ محبت، اپنائیت، اور متوازن رویے پر مبنی ہو۔ نبی کریم ﷺ کی سیرت ہمیں سکھاتی ہے کہ قیادت، تعلیم، اور روزمرہ زندگی میں اعتدال ضروری ہے۔ خوش طبعی صرف ایک عام سی تفریح نہیں بلکہ یہ تعلقات کو مضبوط بنانے، ذہنی دباؤ کو کم کرنے، اور ایک خوشگوار ماحول پیدا کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔

حیات طیبہ سے حزن کے واقعات اور ان کے اثرات

1. حالات اور موقع محل کے مطابق دلی کیفیت کا اظہار

معاشرے میں عمومی تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ مرد کو ہمیشہ مضبوط رہنا چاہیے، اسے اپنے جذبات پر قابو رکھنا چاہیے، اور آنسو بہانا یا غم کا اظہار کرنا اس کی کمزوری کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ یہ تصور مردوں کے لیے ایک غیر حقیقی اور غیر فطری بوجھ بن جاتا ہے، جو انہیں نہ صرف اپنے جذبات کو دبانے پر مجبور کرتا ہے بلکہ آہستہ آہستہ ان کے اندر ہمدردی اور احساس جیسے جذبات کو بھی کمزور کر دیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں، ایک ایسا رویہ پروان چڑھتا ہے جس میں نہ صرف خود کی تکلیف کو نظرانداز کیا جاتا ہے بلکہ دوسروں کے دکھ اور درد کو بھی محسوس کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔

اسی طرح، صبر کو غلط طور پر جذبات کو چھپانے اور کسی بھی صورت میں آنسو نہ بہانے کے مترادف سمجھا جاتا ہے، جبکہ نبی کریم ﷺ کی سیرت اس تصور کی مکمل نفی کرتی ہے۔ آپ ﷺ، جو کہ پوری امت کے رہنما، ریاست کے سربراہ، اور ایک عظیم قائد تھے، نے اپنے غم کو کھل کر ظاہر فرمایا۔ آپ ﷺ نے نہ صرف خود آنسو بہائے بلکہ دوسروں کو بھی سکھایا کہ غم اور حزن کو دبانا نہیں بلکہ فطری انداز میں اس کا اظہار کرنا چاہیے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: "ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ حضرت ابراہیم (آپ ﷺ کے بیٹے) کے پاس گئے، جب وہ آخری سانسیں لے رہے تھے۔ نبی کریم ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: 'یا رسول اللہ! آپ بھی روتے ہیں؟' آپ ﷺ نے فرمایا: 'اے ابن عوف! یہ رحمت ہے۔' پھر آپ ﷺ دوبارہ روئے اور فرمایا: 'آنکھ آنسو بہاتی ہے، دل غمزدہ ہوتا ہے، لیکن ہم وہی بات کہیں گے جو ہمارے رب کو پسند ہے، اور اے ابراہیم! ہم تمہاری جدائی پر بے حد غمزدہ ہیں۔'"[23] (بخاری)

یہ واقعہ ہمارے سامنے کئی اہم پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔

- **صبر کا مطلب جذبات کو دبانا نہیں ہے**

ہمارے معاشرے میں ایک عام غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ صبر کا مطلب ہے کہ انسان کو اپنے غم کو ظاہر نہیں کرنا چاہیے، آنسو نہیں بہانے چاہئیں، اور اپنے جذبات کو سختی سے قابو میں رکھنا چاہیے۔ لیکن نبی کریم ﷺ کے طرزِ عمل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صبر کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ انسان غمزدہ نہ ہو یا وہ اپنے آنسوؤں کو روکے۔

آپ ﷺ نے خود حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات پر روتے ہوئے فرمایا: "آنکھ آنسو بہاتی ہے، دل غمزدہ ہوتا ہے، لیکن ہم وہی بات کہیں گے جو ہمارے رب کو پسند ہے۔" یہ جملہ واضح کرتا ہے کہ صبر کا اصل مفہوم یہ ہے کہ انسان غم کے موقع پر اللہ کی رضا کے خلاف کوئی شکایت نہ کرے، لیکن یہ ہرگز اس کا مطلب نہیں کہ وہ اپنے غم کو ظاہر نہ کرے یا رو نہ سکے۔

- **مرد کے رونے کو کمزوری سمجھنے کا تصور غلط ہے**

نبی کریم ﷺ جو کہ نہ صرف ایک عظیم رسول بلکہ ایک بہادر مجاہد، ایک کامیاب قائد، اور ایک کامل انسان تھے، اپنے بیٹے کی وفات پر روئے۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ آنسو بہانا کمزوری نہیں بلکہ ایک فطری جذبہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر رکھا ہے۔

آج ہمارے معاشرے میں مردوں کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ وہ اپنے غم کو اندر رکھیں، کیونکہ رونا ان کی مردانگی کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ کا طرزِ عمل ہمیں یہ درس دیتا ہے کہ حقیقی مردانگی اپنے جذبات کا صحیح اظہار کرنے میں ہے، نہ کہ انہیں دبانے میں۔ اگر انسان اپنے غم کو دبائے رکھے، تو وہ آہستہ آہستہ سنگدل اور بے حس ہو جاتا ہے، جو کہ اس کے لیے اور اس کے ارد گرد کے لوگوں کے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔

- **جذبات کے اظہار کی اجازت اور اس کا متوازن طریقہ**

نبی کریم ﷺ نے نہ صرف غم کا اظہار فرمایا بلکہ یہ بھی سکھایا کہ غم میں کیا کہا جائے اور کیا نہ کہا جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

"آنکھ آنسو بہاتی ہے، دل غمزدہ ہوتا ہے، لیکن ہم وہی بات کہیں گے جو ہمارے رب کو پسند ہے۔" یہ جملہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ انسان کو اپنے غم کو دبانے کے بجائے فطری انداز میں ظاہر کرنا چاہیے، مگر اس حد تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے خلاف نہ جائے۔ اگر کوئی شخص کسی بڑے صدمے میں مبتلا ہو، تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے جذبات کو تسلیم کرے، رونے اور غمزدہ ہونے میں کوئی حرج نہیں، لیکن شکوہ یا مایوسی کا اظہار نہ کرے۔

- **دوسروں کو بھی غم کے اظہار کا حق دینا**

اس حدیث میں حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے جب نبی کریم ﷺ کو روتے ہوئے دیکھا، تو وہ حیران ہوئے، کیونکہ اس وقت کے عرب معاشرے میں یہ تصور تھا کہ رونا کمزوری ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے نہایت شفقت سے فرمایا: "اے ابن عوف! یہ رحمت ہے۔" یہ الفاظ اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ غمگیں ہونا، آنسو بہانا، اور کسی کی موت پر رنجیدہ ہونا نہ صرف جائز ہے بلکہ یہ انسان کی رحمت اور نرم دلی کی علامت بھی ہے۔

- **غم میں نبی کریم ﷺ کی قیادت اور تعلیم**

نبی کریم ﷺ کے غم کے اظہار کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو عملی طور پر سکھایا کہ غم کے موقع پر کس طرح صبر اور شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے جذبات کا اظہار کرنا چاہیے۔ اگر نبی کریم ﷺ نے سختی اختیار کی ہوتی اور اپنے آنسوؤں کو روک لیا ہوتا، تو صحابہ کرام بھی یہی سمجھتے کہ غم اور حزن کو دبانا ضروری ہے۔ لیکن آپ ﷺ نے سب کے سامنے روتے ہوئے یہ پیغام دیا کہ غم کا اظہار ایک فطری چیز ہے، اور اسے چھپانے کی ضرورت نہیں۔ یہی وہ تعلیم تھی جو بعد میں امت مسلمہ میں رائج ہوئی کہ غم کی گھڑی میں صبر کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کیا جائے، تاکہ دل کا بوجھ ہلکا ہو اور انسان اپنی زندگی کے باقی معاملات کو بہتر انداز میں سنبھال سکے۔

ہمارے معاشرے میں مردوں کو سختی سے سکھایا جاتا ہے کہ انہیں کبھی رونا نہیں چاہیے، کیونکہ وہ خاندان کے محافظ اور کفیل ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب انسان اپنے جذبات کو دبانے لگتا ہے، تو وہ خود کو اور دوسروں کو بھی تکلیف پہنچانے لگتا ہے۔ بہت سے مرد جو اپنے غم کا اظہار نہیں کر پاتے، وہ آہستہ آہستہ ذہنی دباؤ، چڑچڑے پن، اور سنگدلی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ دوسروں کے جذبات کو بھی نہیں سمجھ پاتے، کیونکہ وہ خود اپنے احساسات کو محسوس کرنا چھوڑ چکے ہوتے ہیں۔ **نبی کریم ﷺ کی سیرت ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ مرد ہو یا عورت، ہر انسان کو غمگین ہونے اور اپنے جذبات کے اظہار کا حق حاصل ہے۔ صبر کا مطلب جذبات کو دبانا نہیں، بلکہ انہیں صحیح حدود میں رکھ کر ظاہر کرنا ہے۔ رونا کمزوری نہیں بلکہ رحمت اور احساس کی علامت ہے۔**

اگر ہم نبی کریم ﷺ کی اس تعلیم کو اپنائیں، تو ہم ایک ایسا معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں جہاں افراد کو اپنی فطری جذبات کا اظہار کرنے کی آزادی حاصل ہو، اور وہ ایک دوسرے کے درد کو محسوس کر سکیں۔ حقیقی طاقت اور قیادت اسی میں ہے کہ انسان اپنے جذبات کو دبانے کے بجائے انہیں درست طریقے سے ظاہر کرے اور دوسروں کو بھی ایسا کرنے کی اجازت دے۔

2. اذیت پہنچانے والے کے ساتھ حکمت بھرا برتاؤ

انسانی زندگی میں ایسے مواقع ضرور آتے ہیں جب کوئی شخص یا گروہ ہمیں شدید تکلیف پہنچاتا ہے، خواہ وہ جسمانی ہو، ذہنی ہو، یا جذباتی۔ عام طور پر معاشرتی تعلیم یہی دی جاتی ہے کہ ایک اچھے مسلمان کو چاہیے کہ وہ معاف کر دے اور دل میں کچھ نہ رکھے، لیکن نبی کریم ﷺ کی سیرت ہمیں اس معاملے میں نہایت متوازن اور حقیقت پسندانہ راہ دکھاتی ہے۔ آپ ﷺ نے جہاں عمومی طور پر معافی اور درگزر کا رویہ اپنایا، وہیں کچھ معاملات میں حکمت کے تحت مختلف طرزِ عمل اختیار کیا، خاص طور پر جب تکلیف آپ ﷺ کے قریبی رشتہ داروں اور محبوب ساتھیوں کو پہنچائی گئی۔

روایت میں آتا ہے کہ حضرت وحشی رضی اللہ عنہ، جنہوں نے غزوۂ احد میں نبی کریم ﷺ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا، بعد میں اسلام لے آئے اور بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے۔ حضرت جعفر بن عمرو بن امیہ الضمری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: "جب حضرت وحشی رضی اللہ عنہ آئے، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: 'کیا تم وحشی ہو؟' انہوں نے عرض کیا: 'جی ہاں، یارسول اللہ'! نبی کریم ﷺ نے پوچھا: 'کیا تم نے حمزہ کو قتل کیا؟' انہوں نے کہا: 'جی

ہاں، جو کچھ آپ تک پہنچا ہے وہی درست ہے۔' یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: 'کیا تم ایسا کر سکتے ہو کہ میرے سامنے نہ آیا کرو؟ '''24 (بخاری)

یہ روایت ہمیں حیران کر دیتی ہے، کیونکہ عام طور پر ہم یہی سمجھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہمیشہ اذیت دینے والوں کو معاف کر کے ان کے ساتھ دوبارہ پہلے جیسا ہی رویہ اختیار کر لیتے تھے، جیسے فتح مکہ کے موقع پر قریش کے تمام ظالموں کو معاف کر دیا یا طائف کے لوگوں کے لیے دعا کی۔ لیکن یہاں معاملہ مختلف نظر آتا ہے۔

حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کے اسلام قبول کرنے کے باوجود نبی کریم ﷺ نے ان سے کہا کہ وہ ان کے سامنے نہ آیا کریں۔ اس طرزِ عمل سے ہمیں چند اہم نکات سیکھنے کو ملتے ہیں:

- **جب معاملہ نبی کریم ﷺ کی ذات کا ہوتا، تو آپ ﷺ ہمیشہ معاف فرما دیتے**

نبی کریم ﷺ کی سیرت پر نظر ڈالیں، تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی معاملہ آپ ﷺ کی ذات پر ظلم کا آتا، تو آپ ﷺ نے بے مثال صبر کا مظاہرہ کیا۔ طائف میں آپ ﷺ کو پتھر مارے گئے، جسم سے خون بہایا گیا، مگر بددعا کے بجائے آپ ﷺ نے ان کے لیے ہدایت کی دعا فرمائی۔ فتح مکہ کے موقع پر وہ تمام سردار، جنہوں نے آپ ﷺ پر بے شمار مظالم کیے، انہیں یہ کہتے ہوئے معاف کر دیا: ''آج تم پر کوئی گرفت نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔'' یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیشہ ان لوگوں کو معاف کر دیا جنہوں نے آپ ﷺ کی ذات کو اذیت دی تھی۔

لیکن جب معاملہ آپ ﷺ کے قریبی رشتہ داروں اور ساتھیوں پر ظلم کا ہوتا، تو آپ ﷺ کا رویہ مختلف ہوتا تھا، کیونکہ آپ ﷺ ان کے محافظ تھے، اور کسی بھی ناانصافی کو ان پر روا نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو نہایت ظالمانہ طریقے سے شہید کیا گیا، تو نبی کریم ﷺ نے حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کو معاف تو کر دیا، مگر انہیں اپنے سامنے آنے سے منع کر دیا۔

- **جذباتی صحت کے لیے کچھ زخموں سے فاصلہ رکھنا ضروری ہوتا ہے**

نبی کریم ﷺ نے حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کو معاف کر دیا، لیکن ان سے دور رہنے کا کہا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بعض اوقات معافی دینے کے باوجود انسان کے دل میں ایک ایسا زخم باقی رہتا ہے جو بعض چہروں اور واقعات کو دیکھ کر تازہ ہو جاتا ہے۔ ایسے میں بہتر یہی ہوتا ہے کہ انسان خود کو غیر ضروری تکلیف میں مبتلا نہ کرے اور ایک حد مقرر کر لے۔

یہ اصول آج بھی کارآمد ہے۔ اگر کوئی شخص ماضی میں ہمیں شدید تکلیف دے چکا ہو اور ہم نے اسے معاف کر دیا ہو، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم زبردستی خود کو اس کے قریب کریں اور پرانے زخموں کو ہرا کر لیں۔ نبی کریم ﷺ کا عمل ہمیں سکھاتا ہے کہ ذہنی سکون اور جذباتی صحت کے لیے بعض اوقات فاصلہ رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

- **معافی کے بعد بدلتا ہوا رویہ دوسرے کے لیے اصلاح کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے**

نبی کریم ﷺ کے اس رویے نے حضرت وحشی رضی اللہ عنہ پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ وہ اپنے اندرونی احساسِ جرم کو ختم کرنے کے لیے بعد میں اسلام کے دشمن، مسیلمہ کذاب کو قتل کر کے اپنی تلافی کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔

حضرت وحشی رضی اللہ عنہ بعد میں کہتے ہیں: ''میں نے نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد سوچا کہ اب میں کیسے اپنی خطا کو مٹاؤں؟ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس شخص کو قتل کروں گا جو سب سے بڑا فتنے باز ہو گا۔ یہی وجہ تھی کہ میں

مسیلمہ کذاب کے خلاف جنگ میں شریک ہوا اور میں نے اپنی اسی نیزے سے اسے قتل کیا، جس سے میں نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔[25]"

یہاں ایک اور اہم سبق یہ ہے کہ بعض اوقات کسی شخص کے ساتھ بالکل عام سا رویہ اختیار کرنا اس کے احساسِ ندامت کو کم کر دیتا ہے، جبکہ تھوڑا سا فاصلہ یا سنجیدگی اسے مزید بہتر بننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کو مکمل طور پر مسترد نہیں کیا، بلکہ انہیں اسلام میں شامل ہونے کا موقع دیا، مگر ساتھ ہی انہیں اس حقیقت کا سامنا بھی کروایا کہ ان کے ہاتھوں ایک عظیم انسان شہید ہوا تھا، اور اس احساسِ ذمہ داری نے انہیں ایک بہتر مسلمان بننے میں مدد دی۔

نبی کریم ﷺ کی سیرت ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ اذیت دینے والوں کے ساتھ حکمت کے ساتھ برتاؤ کیا جائے۔ معافی ایک عظیم صفت ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان اپنے جذبات کو دبا لے یا غیر ضروری تکلیف برداشت کرتا رہے۔ اگر کوئی شخص ماضی میں تکلیف دے چکا ہو، تو معافی دینے کے بعد بھی فاصلہ رکھنا جائز ہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا۔ غم کو ظاہر کرنا کمزوری نہیں، بلکہ صحت مند جذباتی رویے کی علامت ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے غم کو تسلیم کیا اور اس کا اظہار بھی کیا، جو ہمیں سکھاتا ہے کہ ہمیں بھی اپنے احساسات کو دبانے کے بجائے ان کا مناسب اظہار کرنا چاہیے۔

3. رنج و غم میں مبتلا افراد کے دکھوں کا مداوا کر کے انہیں معاشرے کا فعال حصہ بنانا

غم اور دکھ انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ بعض اوقات ایسے صدمات پیش آتے ہیں جو انسان کو اندر سے توڑ کر رکھ دیتے ہیں، خاص طور پر جب وہ کم عمری میں کسی بڑے نقصان سے دوچار ہو۔ ان لمحات میں اگر کوئی سہارا نہ دے، تو غمزدہ شخص خود کو اکیلا محسوس کرنے لگتا ہے، اور یہ احساسِ تنہائی اسے آہستہ آہستہ مایوسی اور بے مقصدیت کی طرف لے جا سکتا ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ میں ہمیں ایک نہایت شفیق اور حکمت بھرا طرزِ عمل نظر آتا ہے—آپ ﷺ نے صرف ہمدردی کے الفاظ ادا نہیں کیے، بلکہ دوسروں کے ساتھ ان کے غم میں شریک ہوئے، تاکہ وہ خود کو تنہا محسوس نہ کریں اور ان کا دکھ ان پر غالب نہ آ جائے۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے نہایت قریبی اور محبوب صحابی تھے، جو کہ نبی کریم ﷺ کے منہ بولے بیٹے بھی تھے۔ ان کے فرزند حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ بھی آپ ﷺ کے نہایت محبوب تھے اور آپ ﷺ انہیں اپنا بیٹا کہتے تھے۔ لیکن حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو کم عمری میں ہی ایک عظیم صدمے کا سامنا کرنا پڑا—ان کے والد حضرت زید رضی اللہ عنہ جنگِ موتہ میں شہید ہو گئے۔ یہ ایک ایسا صدمہ تھا جو کسی بھی نوجوان کے لیے برداشت کرنا انتہائی مشکل ہوتا، اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ شدید غم کی حالت میں چلے گئے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے، تو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ غم کی شدت سے نبی کریم ﷺ کی مجلس میں آنا چھوڑ گئے۔ جب وہ ایک دن حاضر ہوئے، تو نبی کریم ﷺ نے انہیں دیکھا اور آپ ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: **"اے اسامہ! تم نے اتنے دن کیوں نہیں آئے؟ کیا تم ہمیں مزید غمگین کرنا چاہتے ہو؟"** اگلے دن جب وہ دوبارہ آئے، تو نبی کریم ﷺ

نے انہیں دیکھ کر فرمایا: **"آج بھی تمہیں دیکھ کر وہی کیفیت ہو رہی ہے جو کل ہوئی تھی۔"** یہ کہتے ہوئے آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔[26](مصنف عبدالرزاق)

یہ وہ لمحہ تھا جب نبی کریم ﷺ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ صرف زبانی تسلی دینے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ان کے غم میں شریک ہو کر انہیں محسوس کروایا کہ ان کا دکھ بانٹنے والا کوئی موجود ہے، اور وہ اس تکلیف میں اکیلے نہیں ہیں۔

ہمارے معاشرے میں عمومی طور پر غم کو جلد از جلد بھول جانے اور "صبر" کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے، جس سے کئی بار غمزدہ افراد کے احساسات کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ کی سیرت ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ غم کو دبانے کے بجائے اسے محسوس کرنا اور تسلیم کرنا ایک صحت مند رویہ ہے۔ اگر نبی کریم ﷺ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے غم کو نظرانداز کر دیتے اور صرف رسمی طور پر چند تعزیتی الفاظ ادا کر کے انہیں فوراً زندگی کی طرف لوٹنے کا کہہ دیتے، تو شاید وہ اپنے غم میں مزید گم ہو جاتے اور ان کی شخصیت میں ایک ایسی کمی رہ جاتی جو بعد میں ان کی ترقی میں رکاوٹ بن سکتی تھی۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے ان کے ساتھ آنسو بہا کر انہیں یہ احساس دلایا کہ ان کے جذبات کی قدر کی جا رہی ہے، اور وہ اکیلے نہیں ہیں۔

یہاں **ایک انتہائی اہم پہلو** کو سمجھنے کی ضرورت ہے: نبی کریم ﷺ کو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا غم دیکھ کر جو تکلیف ہوئی، وہ صرف ان کے والد کی شہادت پر نہیں تھی، بلکہ اس سے کہیں زیادہ گہری تھی۔ جب آپ ﷺ نے **"اے اسامہ! تم نے اتنے دن کیوں نہیں آئے؟ کیا تم ہمیں مزید غمگین کرنا چاہتے ہو؟"** کے الفاظ کہے، تو یہ دراصل **ایک گہرا درد اور حقیقی فکر** تھی۔ اس لمحے نبی کریم یہ دیکھ رہے تھے کہ اگر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ اسی طرح غم میں ڈوبے رہے، تو ان کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ آپ ﷺ یہ منظر برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کا ایک محبوب صحابی، جس میں بے پناہ صلاحیت تھی، غم کی گہرائی میں کھو جائے اور اپنی قابلیت کو ضائع کر بیٹھے۔

یہ دراصل نبی کریم ﷺ کے لیے دوہرے درد کا لمحہ تھا—

1. ایک تو اپنے قریبی ساتھی زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا غم۔
2. اور دوسرا، اپنے محبوب اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو غم میں ڈوبا دیکھ کر یہ خوف کہ کہیں وہ اپنے درد میں اتنا نہ کھو جائیں کہ ان کا مستقبل برباد ہو جائے۔

یہی وجہ تھی کہ نبی کریم ﷺ کا درد الفاظ میں ڈھل گیا۔ اگر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ اسی کیفیت میں رہتے اور نبی کریم ﷺ انہیں اس غم سے نکالنے کے لیے کچھ نہ کرتے، تو وہ شاید مایوسی کی اتھاہ گہرائی میں جا سکتے تھے، جہاں سے واپسی ممکن نہ ہوتی۔

نبی کریم ﷺ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے غم کو صرف تسلیم ہی نہیں کیا، بلکہ اسے بانٹنے کے لیے خود بھی آنسو بہائے۔ یہ انتہائی اہم نکتہ ہے، کیونکہ عام طور پر ایک رہنما، باپ، یا بزرگ یہ سمجھتا ہے کہ اسے ہر حال میں مضبوط نظر آنا چاہیے، اور وہ اپنے جذبات کو چھپاتا ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ انہوں نے عملی طور پر یہ سبق دیا کہ اگر کوئی شخص رو رہا ہے یا غمگین ہے، تو اس کے ساتھ مل کر اس کے جذبات کو بانٹنا چاہیے، تاکہ وہ خود کو اکیلا محسوس نہ

کرے۔ یہی وہ انداز ہے جو کسی غمزدہ شخص کو اندھیروں میں کھونے سے بچا سکتا ہے۔ اگر نبی کریم ﷺ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو کوئی رسمی تسلی دے کر چھوڑ دیتے، تو شاید وہ اپنے غم میں مزید گم ہو جاتے، لیکن آپ ﷺ کے اس طرزِ عمل نے انہیں سہارا دیا اور ایک امید دی۔

- **غم میں شریک ہونا غمزدہ شخص کو دوبارہ زندگی کی طرف لاتا ہے:**

نبی کریم ﷺ کے الفاظ—"کیا تم ہمیں مزید غمگیں کرنا چاہتے ہو؟"—درحقیقت ایک نفسیاتی حکمت کا مظہر تھے۔ اس جملے میں نبی کریم ﷺ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو یہ احساس دلایا کہ وہ اکیلے اپنے والد کے غم میں مبتلا نہیں ہیں، بلکہ ان کے والد کی جدائی سب کے لیے صدمہ ہے۔

یہ ایک انتہائی اہم اصول ہے: اگر غمزدہ شخص کو یہ محسوس کروا دیا جائے کہ اس کی ذات دوسروں کے لیے بھی قیمتی ہے اور اس کی خوشی دوسروں کی خوشی سے جُڑی ہوئی ہے، تو وہ جلدی زندگی کی طرف لوٹ آتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ غم بانٹنا صرف اس وقت کے لیے نہیں تھا، بلکہ اس کے اثرات ان کی پوری زندگی پر مرتب ہوئے۔ اگر نبی کریم ﷺ ان کے غم کو نظر انداز کر دیتے یا انہیں جلدی مضبوط بننے کا کہہ دیتے، تو شاید وہ اپنی صلاحیتوں کو اتنی بہتر طریقے سے استعمال نہ کر پاتے۔

لیکن نبی کریم ﷺ کے ساتھ اس جذباتی تعلق نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو ایک بااعتماد، دلیر، اور عظیم قائد بنایا۔ جب نبی کریم ﷺ نے انہیں 18 سال کی عمر میں ایک بڑے اسلامی لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا، تو کچھ صحابہ نے ان کی کم عمری پر اعتراض کیا، مگر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: **"اسامہ قیادت کے اہل ہیں، جیسے ان کے والد تھے، اور میں انہیں لشکر کا امیر مقرر کر رہا ہوں۔"**[27] یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان کے اندر موجود صلاحیتوں کو پہچانا، انہیں پروان چڑھایا، اور ان کا غم بانٹ کر انہیں تباہی سے بچا کر ایک عظیم مستقبل کے لیے تیار کیا۔

نبی کریم ﷺ کی سیرت ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ غمزدہ افراد کے ساتھ ہمدردی کا اظہار صرف رسمی تسلی کے الفاظ تک محدود نہیں ہونا چاہیے، بلکہ ہمیں ان کے ساتھ حقیقی طور پر ان کے غم میں شریک ہونا چاہیے۔

- اگر نبی کریم ﷺ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے غم کو بانٹ کر انہیں سنبھال نہ لیتے، تو شاید وہ اپنی جوانی کے اس نازک موڑ پر خود کو کھو بیٹھتے۔
- غم میں شریک ہونا کسی کو کمزور نہیں بناتا، بلکہ یہ اس کے جذباتی استحکام میں مدد دیتا ہے، اور نبی کریم ﷺ کا یہی اسلوب حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی زندگی پر مثبت اثر ڈال گیا۔
- اگر ہم بھی اپنے معاشرے میں غمزدہ افراد کو نظر انداز کرنے کے بجائے ان کے ساتھ حقیقی ہمدردی اور غم بانٹنے کا رویہ اختیار کریں، تو ہم نہ صرف ان کی مدد کر سکتے ہیں بلکہ انہیں ایک بہتر اور کامیاب زندگی گزارنے کی طرف بھی لے جا سکتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کے مطابق، ایک کامیاب اور مہذب معاشرہ وہی ہوتا ہے جہاں لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد کو محسوس کریں، اور جہاں کوئی بھی اپنے غم میں تنہا نہ رہے۔ یہی وہ اصول ہے جو ہمیں نبی کریم ﷺ کی سیرت سے سیکھنے کی ضرورت ہے، تاکہ ہم ایک زیادہ ہمدرد اور متوازن معاشرہ تشکیل دے سکیں۔

4. معاشرے کے کمزور طبقات کو تنہا نہ چھوڑنا

کسی بھی مہذب اور عادلانہ معاشرے کی بنیاد اس کے افراد کے ساتھ کیے جانے والے برتاؤ پر قائم ہوتی ہے۔ اگر کسی سماج میں صرف امیر، طاقتور اور بااثر افراد کو ہی اہمیت دی جائے، جبکہ غریب، یتیم، بیمار اور کمزور طبقے کے لوگ نظر انداز کر دیے جائیں، تو وہ معاشرہ ناانصافی، بے حسی اور طبقاتی تقسیم کا شکار ہو جاتا ہے۔ بد قسمتی سے، ہمارے آج کے معاشروں میں یہی کچھ دیکھنے کو ملتا ہے — غریب اور بے سہارا افراد کو اکثر وہ عزت و اہمیت نہیں دی جاتی جو باقی افراد کو دی جاتی ہے، اور ان کی موجودگی کو معمولی سمجھ کر انہیں پسِ پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ ہمیں ایک بالکل مختلف طرزِ عمل سکھاتی ہے۔ آپ ﷺ نے ہمیشہ کمزور، بے سہارا اور نظر انداز کیے جانے والے افراد کو خصوصی توجہ دی، اور ان کے ساتھ ایسا حسن سلوک فرمایا کہ وہ بھی معاشرتی زندگی میں خود کو ایک فعال اور قیمتی فرد محسوس کریں۔

ایک مرتبہ ایک غریب خاتون بیمار ہو گئی، اور نبی کریم ﷺ کو جب ان کی بیماری کی اطلاع دی گئی، تو آپ ﷺ نے فرمایا" : **جب اس کا انتقال ہو جائے تو مجھے اطلاع دینا۔** "یہ جملہ بذاتِ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ ﷺ کے نزدیک کوئی بھی فرد معمولی نہیں تھا۔ یہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ سماج میں غریب اور بے سہارا لوگوں کی بیماری یا موت پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی، لیکن نبی کریم ﷺ کا رویہ بالکل برعکس تھا — آپ ﷺ ہر شخص کی اہمیت کو تسلیم کرتے تھے، اور کسی کو بھی اس کے سماجی مقام کی بنیاد پر نظر انداز نہیں فرماتے تھے۔ لیکن جب وہ خاتون رات کے وقت وفات پا گئیں، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ سوچ کر کہ نبی کریم ﷺ آرام فرما رہے ہیں، آپ ﷺ کو اطلاع دینا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے ان کی تدفین کر دی۔ جب صبح ہوئی اور نبی کریم ﷺ کو اس بارے میں معلوم ہوا، تو آپ ﷺ ناراض ہوئے اور فرمایا" : **کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ مجھے اطلاع دینا؟** "پھر آپ ﷺ فوراً ان کی قبر پر تشریف لے گئے، صحابہ کو صف بندی کا حکم دیا، اور خود ان کی نماز جنازہ ادا فرمائی۔[28] (مسلم)

یہ واقعہ نبی کریم ﷺ کی بے پناہ شفقت، انصاف، اور کمزور طبقات کے ساتھ ان کے منفرد طرزِ عمل کی ایک عظیم مثال ہے۔ اگر آپ ﷺ نے اپنی ناراضگی کا اظہار نہ کیا ہوتا، تو یہ غلط تاثر جاتا کہ شاید معاشرے میں غریب اور نادار لوگوں کی اہمیت کم ہے اور ان کے لیے وہی اہتمام ضروری نہیں جو کسی معزز اور بااثر فرد کے لیے کیا جاتا ہے۔ لیکن آپ ﷺ نے واضح کیا کہ **ہر شخص برابر ہے اور کسی بھی انسان کو اس کے سماجی رتبے کی بنیاد پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔**

یہاں نبی کریم ﷺ کے جذباتی اظہار کی گہری حکمت نظر آتی ہے۔ اگر آپ ﷺ نے اس معاملے پر خاموشی اختیار کی ہوتی، تو شاید یہ روایت بن جاتی کہ غریب اور کمزور افراد کی موت اور تدفین پر زیادہ دھیان نہ دیا جائے۔ لیکن آپ ﷺ کی ناراضگی نے یہ اصول قائم کر دیا کہ **چاہے کوئی شخص کتنا ہی معمولی سمجھا جائے، اس کی عزت و تکریم میں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔** اس واقعے کا اثر نہ صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر ہوا بلکہ یہ ایک ایسا عملی سبق تھا جو آپ ﷺ کے وصال کے بعد بھی ہمیشہ کے لیے امت کے طرزِ عمل کو متاثر کرتا رہا۔

یہ بھی قابل غور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے غریبوں، یتیموں، بیواؤں، بیماروں اور غلاموں کے ساتھ خصوصی شفقت فرمائی، اور ہمیشہ ان کی ضروریات کا خیال رکھا۔ آپ ﷺ نے نہ صرف ان کے ساتھ حسن سلوک کیا، بلکہ انہیں عملی طور پر یہ احساس بھی دلایا کہ وہ معاشرے کا اتنا ہی اہم حصہ ہیں جتنا کہ کوئی دوسرا شخص۔ نبی کریم ﷺ کی محبت اور

توجہ نے ان افراد کو ایک نیا حوصلہ دیا، اور انہوں نے خود کو معاشرتی زندگی کا ایک لازمی عنصر سمجھا، نہ کہ کوئی غیر ضروری بوجھ۔

اگر نبی کریم ﷺ نے اس موقع پر ناراضگی ظاہر نہ کی ہوتی اور اس غریب خاتون کی تدفین کو خاموشی سے قبول کر لیا ہوتا، تو اس کے کئی منفی اثرات ہو سکتے تھے۔ اول تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ سمجھ سکتے تھے کہ صرف بڑے اور بااثر افراد ہی وہ ہیں جن کے جنازے اور آخری رسومات اہم ہوتی ہیں، جبکہ کمزور اور بے سہارا لوگ اس توجہ کے مستحق نہیں۔ دوم، امت میں یہ تاثر عام ہو سکتا تھا کہ غریبوں اور بے سہارا افراد کی موجودگی یا غیر موجودگی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے اپنے طرزِ عمل سے ان تمام غلط تصورات کو جڑ سے اکھاڑ دیا اور واضح کر دیا کہ **اسلامی معاشرے میں کوئی بھی شخص معمولی نہیں ہوتا۔**

یہی اصول ہمیں آج کے معاشرے میں اپنانے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ارد گرد بے شمار ایسے افراد ہیں جو بے سہارا ہیں، جنہیں سماجی اور معاشی مشکلات کا سامنا ہے، اور جو اکثر نظرانداز کر دیے جاتے ہیں۔ اگر ہم نبی کریم ﷺ کی سیرت پر عمل کرتے ہوئے ان کے ساتھ عزت و محبت کا برتاؤ کریں، ان کے جذبات کی قدر کریں، اور انہیں وہی مقام دیں جو باقی افراد کو حاصل ہے، تو ہم ایک بہتر، مساوی اور عادلانہ معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی سیرت ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ ایک کامیاب اور مثالی معاشرہ وہی ہوتا ہے جہاں ہر شخص کو برابری کا درجہ ملے، اور کوئی بھی خود کو بے سہارا یا کم تر محسوس نہ کرے۔ آپ ﷺ نے غریبوں اور کمزور طبقات کے ساتھ صرف زبانی ہمدردی نہیں کی، بلکہ عملی اقدامات کے ذریعے انہیں معاشرے کا ایک فعال اور قابلِ احترام رکن بنایا۔ یہی وہ اصول ہے جو ایک حقیقی اسلامی معاشرے کی بنیاد رکھتا ہے، اور جسے اگر ہم آج اپنا لیں، تو ہم ایک ایسا سماج تشکیل دے سکتے ہیں جہاں محبت، انصاف، اور ہمدردی کے جذبات پروان چڑھیں، اور جہاں کوئی بھی شخص تنہائی یا بے بسی کا شکار نہ ہو۔

5. اللہ سے براہِ راست تعلق کے ذریعے اپنے غم کا تدارک کرنا

غم اور دکھ انسانی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہیں، اور ہر شخص کو کسی نہ کسی مرحلے پر ان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عام طور پر لوگ اپنے غم کو کم کرنے کے لیے مختلف طریقے اپناتے ہیں، جیسے کہ دوسروں سے مشورہ کرنا، تفریحی سرگرمیوں میں مشغول ہونا، یا اپنی پریشانیوں کو وقتی طور پر بھلانے کی کوشش کرنا۔ لیکن نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ میں ہمیں ایک منفرد اور کامل نمونہ ملتا ہے، جہاں آپ ﷺ نے ہر مشکل، ہر پریشانی اور ہر دکھ کے وقت اللہ تعالیٰ سے براہِ راست رجوع کیا، اسی سے مدد مانگی، اور اسی پر توکل کیا۔

نبی کریم ﷺ کی دعا غزوۂ بدر کے موقع پر — مکمل توکل اور بے بسی کا اظہار

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا": غزوۂ بدر کے دن نبی کریم ﷺ نے مشرکین کی طرف دیکھا، جو تعداد میں ایک ہزار تھے، جبکہ آپ ﷺ کے صحابہ کی تعداد 319 تھی۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے قبلہ کی طرف رخ کیا، اپنے ہاتھ بلند کیے اور دعا کرنے لگے **": اے اللہ! مجھے وہ وعدہ پورا کر کے دکھا جو تُو نے مجھ سے کیا ہے۔ اے اللہ! اگر آج یہ چھوٹا سا گروہ (مسلمان) ہلاک ہو گیا، تو زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔"** آپ ﷺ مسلسل دعا کرتے رہے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کی چادر آپ کے کندھوں سے گر

گئی۔ پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی چادر کو دوبارہ اوڑھایا اور عرض کیا: **"یا رسول اللہ! بس کیجیے، اللہ ضرور اپنا وعدہ پورا کرے گا۔"** اس پر اللہ نے قرآن میں فرمایا: ﴿إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ﴾ الأنفال: 9 (مسلم)[29]

یہ واقعہ نبی کریم ﷺ کے اللہ سے گہرے تعلق کی ایک شاندار مثال ہے۔ جب آپ ﷺ کو شدید پریشانی لاحق ہوئی، تو آپ ﷺ نے نہ کسی صحابی سے مدد مانگی، نہ اپنی تدابیر پر بھروسا کیا، بلکہ فوراً اللہ سے دعا کی۔ یہ دعا محض زبانی نہیں تھی، بلکہ آپ ﷺ نے اپنی مکمل عاجزی اور بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے اللہ کے سامنے گڑگڑایا، یہاں تک کہ آپ ﷺ کی چادر کندھوں سے گر گئی۔ یہ منظر ہمیں سکھاتا ہے کہ جب انسان کسی بڑی پریشانی یا آزمائش میں مبتلا ہو، تو سب سے پہلا قدم اللہ سے دعا اور اس پر مکمل توکل ہونا چاہیے۔ نبی کریم ﷺ نے یہ نہیں کہا کہ "ہم بہادر جنگجو ہیں، ہم تدابیر کر چکے ہیں"، بلکہ آپ ﷺ نے تسلیم کیا کہ اگر اللہ کی مدد نہ ہوئی، تو کچھ نہیں ہو سکتا۔

غم کا علاج—نبی کریم ﷺ کی سکھائی ہوئی دعائیں

نبی کریم ﷺ نے اپنی زندگی میں کئی دعائیں سکھائیں جو غم، پریشانی، اور مشکلات میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

- يَا حَيُّ يَا قَيُّومُ بِرَحْمَتِكَ أَسْتَغِيثُ

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: "جب نبی کریم ﷺ کو کوئی پریشانی لاحق ہوتی، تو آپ ﷺ یہ دعا پڑھتے: 'اے ہمیشہ زندہ رہنے والے، اے تمام مخلوقات کو قائم رکھنے والے، میں تیری رحمت کی بارش میں بھیگنے کی فریاد کرتا ہوں!'"[30]

یہ دعا عام طور پر یوں ترجمہ کی جاتی ہے کہ **"اے ہمیشہ زندہ اور سب کو قائم رکھنے والے، میں تیری رحمت کی بھیک مانگتا ہوں"**، لیکن عربی کے اصل الفاظ میں **"أَسْتَغِيثُ"** کا مطلب صرف مدد مانگنا نہیں بلکہ **بارش کی طلب کرنا** بھی ہے۔ اس کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ ہم اللہ سے اس کی رحمت کی ایسی بارش مانگ رہے ہیں جو ہمیں مکمل طور پر سیراب کر دے، جس طرح ایک خشک زمین بارش سے زندہ ہو جاتی ہے۔

یہ دعا ایک انتہائی گہرے جذباتی احساس کا اظہار کرتی ہے—جب انسان کو غم لاحق ہوتا ہے، تو اس کے اندر ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے، ایک سوکھا پن آ جاتا ہے، اور وہ ہر وقت آنسوؤں میں ڈوبا رہتا ہے۔ لیکن یہاں نبی کریم ﷺ ہمیں سکھاتے ہیں کہ اس وقت اللہ سے یہ دعا مانگنی چاہیے کہ **"اے اللہ! مجھے اپنی رحمت کی ایسی بارش سے بھگو دے کہ میرے اندر غم کی کوئی خشکی باقی نہ رہے، بلکہ ہر جگہ صرف تیری رحمت ہو۔"**

- اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحُزْنِ

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: میں نبی کریم ﷺ کی خدمت کیا کرتا تھا، اور میں نے آپ ﷺ کو اکثر یہ کہتے سنا": اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں فکر اور غم سے، قرض کے بوجھ سے، اور لوگوں کے ظلم و جبر سے۔"[31]

یہ دعا حیران کن طور پر ایک مکمل نفسیاتی علاج ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہا گیا ہے کہ **"اے اللہ! مجھے غم سے نکال دے "** بلکہ اس سے پہلے ہی یہ دعا سکھائی گئی کہ **"اے اللہ! مجھے غم میں مبتلا ہونے سے ہی بچا لے"**۔ یعنی یہ دعا صرف علاج نہیں، بلکہ ایک حفاظتی تدبیر بھی ہے۔

یہ امر بھی غور طلب ہے کہ **دونوں دعاؤں کے راوی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں۔** یہ محض اتفاق نہیں بلکہ ایک گہری حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ وہ صحابی ہیں جو **نبی کریم ﷺ کے خادمِ خاص تھے**، یعنی وہ ہر وقت آپ ﷺ کے ساتھ رہتے، آپ کی روزمرہ کی عادات کو قریب سے دیکھتے، اور ہر مشکل گھڑی میں آپ ﷺ کے ردِ عمل کے گواہ ہوتے تھے۔

اگر حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ یہ دعائیں **"بہت زیادہ "** پڑھتے تھے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دعائیں نبی کریم ﷺ کے لیے ایک لازمی معمول تھیں، اور یہی وہ دعائیں تھیں جنہوں نے آپ ﷺ کی زندگی میں ہر مشکل میں آپ کو سکون اور طاقت دی۔

یہ دونوں دعائیں آج بھی ہر مسلمان کے لیے ایک نسخۂ شفا ہیں۔ جب بھی غم، پریشانی، یا کوئی مشکل درپیش ہو، تو یہی وہ الفاظ ہیں جو نبی کریم ﷺ کے دل کو سکون دیتے تھے، اور یہی الفاظ آج بھی ہمیں اللہ کے قریب کر سکتے ہیں۔

6. تکلیف اور دکھ کی کیفیت میں بھی اپنے ماتحت لوگوں کو اپنی نگاہ میں رکھنا

قیادت کا ایک اعلیٰ ترین اصول یہ ہے کہ مشکل اور صدمے کے لمحات میں بھی اپنے پیروکاروں اور ماتحتوں کے جذبات، ضروریات اور ان کی تربیت کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ ایک حقیقی رہنما وہی ہوتا ہے جو ذاتی غم میں مبتلا ہونے کے باوجود اپنے ساتھیوں کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کو سمجھنے اور انہیں درست راہنمائی فراہم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ میں ہمیں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں، لیکن خاص طور پر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آنے والا ایک واقعہ اس کی ایک منفرد مثال ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں": جب نبی کریم ﷺ کے خاندان میں کسی کا انتقال ہوا، تو عورتیں اس پر غم اور رنج کے باعث رو رہی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں روکنا چاہا اور وہاں سے ہٹانے کی کوشش کی، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: 'عمر! انہیں چھوڑ دو، کیونکہ آنکھ آنسو بہاتی ہے، دل غمزدہ ہوتا ہے، اور جدائی کا وقت ابھی قریب ہے۔ '"(نسائی)[32]

یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب نبی کریم ﷺ خود شدید صدمے میں تھے کیونکہ ان کے قریبی عزیز کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس غم کے باوجود، آپ ﷺ نے اپنے ماتحتوں، خاص طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ، کی تربیت کا موقع ضائع نہیں ہونے دیا۔

یہاں نبی کریم ﷺ کا طرزِ عمل ہمیں کئی گہرے اصول سکھاتا ہے:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بعد میں اسلامی خلافت کے عظیم حکمران بنے، لیکن اس وقت ان کی طبیعت میں سختی زیادہ تھی۔ وہ اسلامی احکام پر فوری عمل چاہتے تھے، بغیر یہ دیکھے کہ موقع اور کیفیت کیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ان کی اصلاح کی اور انہیں سکھایا کہ ہر موقع پر سختی مناسب نہیں ہوتی، بلکہ حکمت اور نرمی کے ساتھ معاملات کو سمجھنا ضروری ہے۔ یہی حکمت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں نمایاں نظر آئی—وہ سختی میں بھی عدل رکھتے، لیکن ساتھ ہی کمزوروں اور یتیموں کے لیے نہایت نرم دل ثابت ہوئے۔

یہاں سب سے قابل غور پہلو یہ ہے کہ **نبی کریم ﷺ خود ایک شدید صدمے میں تھے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اصلاح کو نظر انداز نہیں کیا۔** یہ ایک عام انسانی کیفیت ہے کہ جب کوئی شخص غم میں ہوتا ہے، تو وہ اپنے آس پاس کے افراد سے غافل ہو جاتا ہے، ان کی غلطیوں پر توجہ نہیں دیتا، اور بعض اوقات سخت رویہ اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے ایسا نہیں کیا۔ آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سختی سے نہیں جھڑکا، بلکہ نرمی سے سکھایا کہ بعض مواقع پر لوگوں کو ان کے جذبات کے ساتھ چھوڑ دینا زیادہ مناسب ہوتا ہے۔

یہ رویہ آج کے رہنماؤں، والدین، اساتذہ اور منتظمین کے لیے ایک عظیم سبق ہے—اگر کوئی استاد، والد، یا قائد خود کسی غم میں مبتلا ہو، تو بھی اسے اپنے زیرِ اثر افراد کی تربیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ نبی کریم ﷺ کی طرح ہمیں بھی جذباتی استحکام پیدا کرنا چاہیے تاکہ ہم دوسروں کی غلطیوں کو درست وقت پر درست انداز میں ٹھیک کر سکیں۔

اگر نبی کریم ﷺ ایسا نہ کرتے، تو اس کے اثرات کیا ہوتے؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ **اگر نبی کریم ﷺ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اصلاح نہ کرتے، تو اس کا مستقبل میں کیا اثر پڑتا؟**

1. اگر نبی کریم ﷺ نے اس وقت انہیں نہ روکا ہوتا، تو ان کے لیے ممکن تھا کہ وہ ہمیشہ ہر موقع پر سختی برتنے کو ہی درست سمجھتے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ان کی خلافت میں رحم دلی اور نرمی کی وہ جھلک نظر نہ آتی جو بعد میں ان کا خاصہ بنی۔
2. حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلامی تاریخ کے سب سے بڑے حکمرانوں میں سے ایک ہیں، اور ان کا طرزِ حکمرانی آنے والی نسلوں کے لیے ایک مثال بنا۔ اگر وہ مکمل طور پر سختی کی طرف مائل ہو جاتے، تو اس کے اثرات پوری امت پر پڑ سکتے تھے، اور اسلامی معاشرہ ایک رحم دل اور متوازن امت کے بجائے ایک سخت گیر اور بے لچک امت کی صورت اختیار کر سکتا تھا۔

یہ نبی کریم ﷺ کی عظیم قیادت ہی تھی جس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے سخت مزاج فرد کو ایک متوازن، نرم دل، اور عادل حکمران بنا دیا۔ جب وہ خلیفہ بنے، تو انہوں نے عدل و انصاف کو اپنی حکمرانی کی بنیاد بنایا، لیکن ساتھ ہی غریبوں، یتیموں، اور مظلوموں کے لیے نرمی اور شفقت کا رویہ اپنایا۔ یہ سب نبی کریم ﷺ کی اس تعلیم کا اثر تھا جو انہوں نے صرف زبانی نہیں بلکہ عملی مثال کے ذریعے دی تھی۔

نتائج و خلاصہ

اس تحقیق کے دوران نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ میں خوشی اور غم کے واقعات اور ان کے اثرات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔ درج ذیل نکات ان تمام مباحث کا خلاصہ پیش کرتے ہیں، جو اس مقالے میں زیرِ بحث آئے:

معاشرتی اثرات

1. **اتحادِ امت** — نبی کریم ﷺ کے خوشی کے اظہار نے صحابہ کرام کے دلوں میں محبت، اخوت، اور ایثار کا جذبہ پیدا کیا، جس کے نتیجے میں امتِ مسلمہ ایک مضبوط اور متحد قوم بنی۔

2. **امید کی کرن اجاگر کرنا** – مشکل حالات میں نبی کریم ﷺ کی خوشی اور مثبت رویہ امت کے لیے امید کا ذریعہ بنا، جس نے صحابہ کو ہر آزمائش میں ثابت قدم رکھا۔
3. **اجتہاد کی حوصلہ افزائی** – آپ ﷺ کی خوشی اور حوصلہ افزائی نے صحابہ کرام کو اجتہاد اور غور و فکر کی طرف راغب کیا، جس کے باعث اسلامی علوم میں ترقی ممکن ہوئی۔
4. **بین الاقوامی تعلقات میں حسنِ سلوک** – نبی کریم ﷺ کے مسکراتے ہوئے غیر مسلموں سے حسنِ سلوک نے بین المذاہب مکالمے اور پرامن بقائے باہمی کی بنیاد رکھی۔
5. **افراد کے ساتھ ان کے مرتبے کے مطابق رویہ** – نبی کریم ﷺ کا ہر فرد کو اس کی صلاحیتوں کے مطابق عزت دینا قیادت کا ایک لازمی اصول بنا، جس نے سماجی استحکام کو فروغ دیا۔

انفرادی اثرات

6. **فرد کی فطری طبع کے اظہار پر خوشی** – نبی کریم ﷺ نے صحابہ کو ان کے فطری مزاج کے مطابق عمل کرنے کا موقع دیا، جس سے ان میں خود اعتمادی پیدا ہوئی۔
7. **فرد کی صلاحیت میں نکھار** – نبی کریم ﷺ نے صحابہ کی علمی اور فکری صلاحیتوں کو اجاگر کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی، جس سے وہ امت کے عظیم رہنما بنے۔
8. **روزمرہ کے تعامل میں سنجیدگی کے ساتھ حسِ مزاح** – نبی کریم ﷺ کی زندگی میں مزاح کا متوازن استعمال، تعلقات میں محبت اور اپنائیت کا سبب بنا، جس سے صحابہ کو ذہنی سکون اور تربیت کا موقع ملا۔

غم کے اظہار کے اثرات

9. **حالات کے مطابق دلی کیفیت کا اظہار** – نبی کریم ﷺ کا غم کے موقع پر آنسو بہانا اس بات کی دلیل تھا کہ جذبات کو دبا کر رکھنے کے بجائے، انہیں متوازن انداز میں ظاہر کرنا چاہیے۔
10. **اذیت پہنچانے والوں کے ساتھ حکمت بھرا رویہ** – نبی کریم ﷺ نے معاف کرنے کے ساتھ حکمت عملی اپنائی، جہاں ضرورت ہو وہاں فاصلہ رکھا، تاکہ امت کو انصاف اور رحمت کا درست توازن سکھایا جا سکے۔
11. **غم میں مبتلا افراد کی دلجوئی** – نبی کریم ﷺ نے دوسروں کے غم میں شریک ہو کر ان کی تسلی کی، جس نے معاشرے میں ہمدردی اور اخوت کو فروغ دیا۔
12. **کمزور طبقات کا خیال رکھنا** – نبی کریم ﷺ نے غریبوں، یتیموں، اور کمزور طبقات کی عزت کی، اور انہیں تنہا نہ چھوڑنے کا عملی نمونہ پیش کیا۔
13. **اللہ سے براہِ راست تعلق کے ذریعے غم کا تدارک** – نبی کریم ﷺ نے غم کے وقت دعا اور توکل کو اختیار کر کے امت کو دکھایا کہ سب سے بڑا سہارا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔
14. **غم کی کیفیت میں بھی اپنے ماتحتوں کا خیال رکھنا** – نبی کریم ﷺ نے اپنی تکلیف کے باوجود اپنے ساتھیوں کی رہنمائی کی، جس نے بعد میں ان کی قیادت کو مضبوط اور عادل بنایا۔

یہ 14 نکات نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ سے خوشی اور غم کے اظہار کے اثرات کو واضح کرتے ہیں اور ہمارے لیے عملی نمونہ فراہم کرتے ہیں کہ کس طرح ہم اپنی زندگی میں توازن، ہمدردی، اور اللہ پر توکل کے ساتھ ایک متوازن شخصیت تشکیل دے سکتے ہیں۔

سفارشات:

1. **سیرتِ نبوی ﷺ کا گہرا مطالعہ:** امت مسلمہ کو چاہیے کہ نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ میں موجود خوشی اور غم کے مواقع کا گہرائی سے مطالعہ کریں تاکہ ان کے جذباتی اور عملی پہلوؤں کو اپنی زندگی میں نافذ کر سکیں۔
2. **دینی تعلیمات میں نفسیاتی پہلوؤں کی شمولیت:** مدارس اور تعلیمی اداروں میں دینی نصاب میں ایسے موضوعات شامل کیے جائیں جو نبی کریم ﷺ کی نفسیاتی حکمتِ عملی کو واضح کریں تاکہ طلبہ کو نہ صرف شرعی علوم بلکہ نفسیاتی اور سماجی بصیرت بھی حاصل ہو۔
3. **مسرت اور رنج کے اظہار میں اعتدال:** اسلامی تعلیمات کی روشنی میں امت کو سکھایا جائے کہ وہ خوشی اور غم کے مواقع پر افراط و تفریط سے بچیں، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں سکھایا کہ ہر حالت میں اللہ کی رضا کو مقدم رکھا جائے۔
4. **قائدین اور والدین کے لیے راہنمائی:** اسلامی معاشروں میں والدین، اساتذہ، اور رہنماؤں کو یہ سیکھنا چاہیے کہ وہ اپنے زیرِ کفالت افراد کے جذباتی اتار چڑھاؤ کو کیسے سنبھالیں اور انہیں امید و حوصلہ فراہم کریں۔
5. **نفسیاتی مسائل کے حل کے لیے سیرتِ طیبہ سے رہنمائی:** آج کے دور میں بڑھتے ہوئے ذہنی دباؤ، ڈپریشن اور مایوسی کے خاتمے کے لیے سیرتِ نبوی ﷺ کو بطور عملی مثال اپنانا چاہیے تاکہ امت ایک متوازن اور خوشحال زندگی گزار سکے۔
6. **امت کے اتحاد کے لیے عملی اقدامات:** امت میں محبت، ایثار اور ہمدردی کے جذبات کو فروغ دینے کے لیے نبی کریم ﷺ کے طرزِ عمل کو اپنایا جائے، تاکہ مسلمانوں کے درمیان باہمی اختلافات کم ہوں اور اتحاد کی فضا قائم ہو۔
7. **معاشرتی فلاح و بہبود کے لیے عملی منصوبے:** معاشرتی سطح پر ایسے اقدامات کیے جائیں جہاں یتیموں، مساکین اور پریشان حال افراد کو سہارا دیا جائے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کو ہمیشہ غمزدہ افراد کی دلجوئی کی تلقین فرمائی۔

یہ سفارشات نبی کریم ﷺ کی سیرتِ مبارکہ کے مطالعے سے اخذ کی گئی ہیں اور ان پر عمل کرنے سے امتِ مسلمہ کو سماجی، دینی، اور روحانی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

References

1. البخاري، محمد بن إسماعيل، صحيح البخاري، تحقيق: مصطفى ديب البغا، دار ابن كثير، بيروت، الطبعة الثالثة، 1987، كتاب المناقب، باب ذكر جرير بن عبد الله، حديث رقم 3036، ج5، ص150.
2. مسلم بن الحجاج، صحيح مسلم، تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولى، 1955، كتاب الفضائل، باب تبسم النبي ﷺ لجرير، حديث رقم 2475، ج4، ص1915.
3. النووي، يحيى بن شرف، شرح صحيح مسلم، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الثالثة، 2001، ج6، ص219.
4. ابن بطال، علي بن خلف، شرح صحيح البخاري، تحقيق: ياسر بن إبراهيم، مكتبة الرشد، الرياض، الطبعة الأولى، 2003، ج9، ص 281.
5. ابن حجر العسقلاني، فتح الباري شرح صحيح البخاري، تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الثانية، 1993، ج 10، ص487.
6. القرطبي، أبو العباس أحمد بن عمر، المفهم لما أشكل من تلخيص صحيح مسلم، تحقيق: محمد حسن إسماعيل، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، 2006، ج3، ص121.
7. مسلم بن الحجاج، صحيح مسلم، تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولى، 1955، كتاب الصلاة، باب ذكر حديث جابر بن سمره، حديث رقم 2323، ج2، ص601.
8. ابن القيم الجوزية، مدارج السالكين بين منازل إياك نعبد وإياك نستعين، تحقيق: محمد المعتصم بالله البغدادي، دار الكتاب العربي، بيروت، الطبعة الثانية، 1996، ج1، ص456.
9. الخطابي، حمد بن محمد، معالم السنن في شرح سنن أبي داود، تحقيق: عادل نويهض، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثانية، 2004، ج2، ص98.
10. الترمذي، محمد بن عيسى، سنن الترمذي، تحقيق: بشار عواد معروف، دار الغرب الإسلامي، بيروت، الطبعة الأولى، 1998، كتاب الدعوات، باب ما جاء في دعاء النبي ﷺ عند الكرب، حديث رقم 3524، ج5، ص515.
11. ابن ماجه، محمد بن يزيد القزويني، سنن ابن ماجه، تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي، دار إحياء الكتب العربية، القاهرة، الطبعة الأولى، 1952، كتاب الدعاء، باب الاستعاذة من الهم والحزن، حديث رقم 3883، ج2، ص1271.
12. أحمد بن حنبل، مسند الإمام أحمد، تحقيق: شعيب الأرناؤوط، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولى، 2001، حديث أنس بن مالك عن دعاء النبي ﷺ، حديث رقم 27174، ج45، ص268.
13. السندي، محمد بن عبد الهادي، حاشية السندي على سنن النسائي، تحقيق: عبد الفتاح أبو غدة، مكتب المطبوعات الإسلامية، حلب، الطبعة الأولى، 1986، ج4، ص213.
14. البخاري، محمد بن إسماعيل، صحيح البخاري، تحقيق: مصطفى ديب البغا، دار ابن كثير، بيروت، الطبعة الثالثة، 1987، كتاب الجنائز، باب قول النبي ﷺ: "إِنَّا بِفِرَاقِكَ لَمَحْزُونُونَ"، حديث رقم 1303، ج2، ص85.
15. مسلم بن الحجاج، صحيح مسلم، تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولى، 1955، كتاب الفضائل، باب ترحم النبي ﷺ على سعد بن عبادة، حديث رقم 2315، ج4، ص1807.
16. ابن ماجه، محمد بن يزيد القزويني، سنن ابن ماجه، تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي، دار إحياء الكتب العربية، القاهرة، الطبعة الأولى، 1952، كتاب الجنائز، باب البكاء على الميت، حديث رقم 1589، ج1، ص503.

17. أحمد بن حنبل، مسند الإمام أحمد، تحقيق: شعيب الأرناؤوط، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولى، 2001، حديث زيد بن ثابت عن دموع النبي صلى الله عليه وآله وسلم، حديث رقم 21666، ج36، ص57.
18. الطبراني، سليمان بن أحمد، المعجم الكبير، تحقيق: حمدي عبد المجيد السلفي، مكتبة العلوم والحكم، الموصل، الطبعة الأولى، 1983، حديث رقم 2220، ج2، ص45.
19. البخاري، محمد بن إسماعيل، صحيح البخاري، تحقيق: مصطفى ديب البغا، دار ابن كثير، بيروت، الطبعة الثالثة، 1987، كتاب فضائل الصحابة، باب ذكر خديجة، حديث رقم 3818، ج7، ص90.
20. مسلم بن الحجاج، صحيح مسلم، تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولى، 1955، كتاب الفضائل، باب ذكر خديجة، حديث رقم 2435، ج4، ص1889